KITAB JAHAN

بہنوں کا اپنا ماہنامہ

شعاع

واٹس اپ
03172266944

بانی: محمود ریاض

مدیرِ اعلیٰ ---- اختر ریاض
مدیرہ ---- فصیحہ جمیل
مدیرِ تخلیق ---- امۃ الصبور
پبلشنگ ڈائریکٹر ---- شاہین رشید
قانونی مشیر ---- [illegible]

مکمل ناول

شہرِ شامِ ہجر	فوزیہ غزل	134
ماء الملوک	نگہت سیما	118
دستورِ وفا	مریم عزیز	148
پھول زلفوں میں	نگہت	75

KITAB JAHAN

ناولٹ

چوتھی بہو	راشدہ رفعت	56

افسانے

مالِ غنیمت	[illegible]	50
وقتی فائدہ	نمی آصف	76
معتبر	صائمہ نور	113
چند لقموں کی خاطر	نفیسہ سعید	44

پہلی شعاع	مدیرہ	6
حمد	محمد اعظم چشتی	7
نعت	ادا جعفری	7
نبی کی باتیں	ادارہ	8

انٹرویو

سائرہ یوسف سے ملاقات	شاہین رشید	19
دستک	شاہین رشید	17
جب تجھ سے ناتا	ف۔م۔بٹ	13

ناول

والعصر	امۃ العزیز شہزاد	30

احتیاط: ماہنامہ شعاع ڈائجسٹ کے جملہ حقوق محفوظ ہیں۔ [illegible]

فلک تنویر

پھول زلفوں میں

NOVELS LAND

وہ کھڑکی میں کھڑی تھی۔ کھڑکی کے اس پار شام قطرہ قطرہ رات کی سیاہی میں پگھل رہی تھی۔

پیچھے کمرے میں طوفان کے بعد والی خاموشی طاری تھی۔ آف وائٹ پینٹ شدہ دیوار پر چائے کی خشک لکیر اور اس کے ارد گرد دھبے...... دیوار کے نیچے قالین پر ٹوٹا کپ' پلیٹ اور چار جر......

وہ یک ٹک باہر کے منظر کو دیکھ رہی تھی۔ چنار کے پتے' پت جھڑ کے زیر اثر تھے۔ تائی کے تخت پر پڑی سبزی کی ٹوکری ویسے ہی پڑی تھی۔ تائی پڑوس میں کسی کی عیادت کے لیے گئی تھیں اور زین شاید والی بال کھیلنے بڑے میدان میں۔ گھر میں ابھی تایا ٹی وی پر خبرنامہ لگائے بیٹھے ہوں گے' کبیر اتنا ہنگامہ کرنے کے بعد اب کسی دوست کی بیٹھک میں بیٹھا لڈو کھیل رہا ہوگا...... یا پھر کرکٹ کا میچ دیکھ رہا ہوگا...... رات دس بجے سے پہلے وہ نہیں آنے والا تھا۔

معاً صوفے پر اس کا موبائل تھرتھرانے لگا۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو ''مینو کالنگ'' لکھا آرہا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ کال اٹھاتے ہوئے مینو کی شکایتوں کی پوٹلی فوراً کھل جائے گی۔ پہلے تو اس نے فون نہ اٹھانے کا سوچا' لیکن مینو ڈھیٹ پن سے کال پر کال کیے جا رہی تھی۔ چاروناچار اس کو اٹھانا پڑا۔

''کیا یار پلوشہ باجی! کال اٹھا رہی ہیں آپ اور نہ ہی واٹس ایپ پر میسج کا ریپلائی۔'' حسب معمول وہ سلام بھول کر ناراضی سے کہہ رہی تھی۔

''ہاں ہاں۔ اب آپ کے رٹے رٹائے بہانے شروع ہو جائیں گے۔ تائی گھر پر نہیں ہیں' شوہر نامدار کی خدمتیں کرنا تھیں۔ اس کے زین کے دوست آئے تھے۔''

نا چاہتے ہوئے بھی مینو کے انداز پر لمحے بھر کے لیے مسکرائی۔

''ایسا ہی ہے مینو۔'' وقفے کے بعد اس نے بولنا شروع کیا تو اس کے لہجے میں ٹھہری نمی مینو سے چھپ نہ سکی۔ اس نے تھوک نگلا تھا۔

''کچھ ہوا ہے کیا پلوشہ باجی؟'' مینو تشویش سے استفسار کر رہی تھی۔

گلے میں آنسوؤں کا ایک گولا پھر سے بن گیا تھا' لیکن اس نے سنبھل کر بات کرنا شروع کی۔

''تائی ابھی بھی گھر پر نہیں ہیں۔ یہ ایک ہفتہ تو انہوں نے بستر پر گزارا۔ ان کا بی پی کنٹرول نہیں ہو رہا تھا۔''

''ہاں تو پرہیز کیا کریں ناں۔ اس دن بھی شادی ہال میں ایسے ٹھونس ٹھونس کر چاول کھائے جا رہی تھیں۔ میں نے کہا' تائی بی پی شوٹ کر جائے گا آپ کا۔ پاس بیٹھی رخشندہ پھپھو سے کہنے لگیں کہ زبان کے ذائقے کے لیے ایک دو نوالے لیے اور یہ اس پر بھی نظر رکھے ہوئے ہے۔ شادی کے بعد یہ تو میرا کھانا ہی بند نہ کر دے۔ ہر کسی کی نیکی کو دریا میں پھینک دینے کی عادت ان کی پکی ہو چکی ہے۔'' مینو کے لہجے سے ناگواری ٹپک رہی تھی۔ آخر میں ایک لمبا ''ہونہہ'' کا اضافہ بھی کیا۔

''تم بھی ہر جگہ اپنی ''حکمت'' مت جھاڑا کرو۔ وہ تو ہر بات اپنے بیٹوں کو بتا دیا کرتی ہیں۔

مکمل ناول

شادی سے آنے کے بعد رات کو زین کو یہ قصہ سنا رہی تھیں۔" بلوشہ اس کو سمجھانے لگی لیکن آگے سے مینو کا لہجہ بگڑ چکا تھا۔

"ابھی سے زہر گھول رہی ہیں...... ہونہہ......

اور ان کے صاحبزادے ویسے بھی "مور خانیان" (ماں کی ہر بات ماننے والے ہیں) ماں بیگم جو بھی کہہ دیں مانو پتھر پر لکیر۔"

"تو جب اتنا تائی کی پرسنالٹی پر ریسرچ کر چکی ہو تو ذرا احتیاط بھی برتا کرو نا۔"

"واٹ ایور۔" مینو کا موڈ خراب ہو چکا تھا۔ کچھ لمحے توقف کے بعد وہ پوچھنے لگی۔ "خیر یہ سب چھوڑیں۔ ایک ہفتہ ہو گیا آپ آئیں نہیں۔ کون سا پشاور بیاہی گئی ہیں آپ۔ تیس منٹ کا راستہ ہی تو ہے میکے تک۔"

"بتایا تو ہے تائی بیمار تھیں۔" اس نے حیلہ تراشا۔

"بلوشہ باجی ...... ایک ہفتے سے ابو بھی بیمار ہیں...... تائی کی خدمت کرنا ٹھیک ہے آپ کی ذمہ داری ہو گی لیکن ابو کی تیمارداری کرنا بھی تو ان کی پہلی اولاد پر فرض ہے۔"

اب کی بار مینو کے لہجے میں ٹھیک ٹھاک ناراضی بھی اور دکھ بھی...... یہ سنتے ہی وہ اپنا درد بھول چکی تھی اور کچھ دیر پہلے ہو چکا طوفان بھی...... وہ دکھ اور پشیمانی کے احساس سے بت بن گئی۔ سکتے کی حالت میں کھڑی اس سے کچھ بولا ہی نہ گیا۔

"آئی ایم سوری...... میں نے اس ایک ہفتے میں موبائل زیادہ یوز نہیں کیا اور...... تم نے مجھے کال کر کے بتایا کیوں نہیں؟"

"ابو نے منع کیا تھا کہ بلاوجہ پریشان ہوں گی۔ اب اپنے ایکسکیوز اور گلٹ سائیڈ پر رکھیے اور جلدی سے آئیے۔ رخشندہ پھپھو کی عمر کچھ زیادہ بڑھنے والی ہے جب جب یاد کرتے ہیں۔ حاضر ہو جاتی ہیں۔ میں جاتی ہوں۔ خدا حافظ۔" مینو نے جس موڈ میں بات شروع کی تھی اس میں ختم بھی کی تھی۔

اور وہ...... یعنی بلوشہ کبیر، دکھ سے وہیں کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ یہ ہفتہ کیسا عذاب گزرا یہ تو وہ جو گزار چکی، وہی جانتی تھی۔ تائی کا بیمار رہنا تو محض ایک حیلہ بہانہ تھا۔ اصل وجہ تو "کبیر" تھا۔ اس کا شوہر۔

جو ابھی کچھ دیر پہلے آفس سے آنے کے بعد برے موڈ میں تھا۔ اس سے چائے میں چینی تھوڑی کم ہو گئی تھی اور دوسرے گھونٹ پر کبیر نے چائے کا کپ پلیٹ میں رکھے سینڈوچ کے ساتھ دیوار پر دے مارا۔

وہ جو سامنے کھڑی اس کے تاثرات سے ہی جانچ کر رہی تھی کہ اس نے اس دفعہ کیا کمی بیشی کی ہو گی...... سہم کر دیوار میں انارکلی کی طرح چن گئی۔ کبیر نے سائیڈ ٹیبل پر رکھا موبائل کا چارجر اٹھا کر اس پر دے مارا وہ ٹوٹ کر کرچی کرچی ہو گیا۔ ایک کرچی اس کے دائیں ہاتھ میں چبھی اور خون بہنا شروع ہو گیا۔

وہ اول فول بکتا جا رہا تھا ایسے میں تایا اندر داخل ہو گئے اور اس کو خوب سنائیں لیکن وہ ہنوز چلاتا رہا......

"باہر سے تھک ہار کر آؤ تو بھی سوکھی روٹی رکھتی ہے سامنے...... کبھی سیلاب کے پانی جیسی چائے...... کم اصل سمجھ رکھا ہے اس نے مجھے......"

دروازے کو لات مارتا وہ تن فن کرتا گھر سے نکل گیا۔ وہ وہیں سہم کر ڈری ہوئی کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ اس کو اپنا درد نہیں ستا رہا تھا بس اپنی عزت نفس کی کرچیاں ہونے پر دکھی تھی کہ دیوار کے اس پار شام کی چائے پر پڑوسیوں کا موضوع بحث ہو گی وہ...... ایک بری اور پھوہڑ بیوی کا ستایا سارے دن کی محنت کرتا ایک مظلوم شوہر......

تایا افسوس بھرے انداز میں اس کو دلاسے کے چند بول، بول کر جا چکے تھے اور وہ وہیں بت بنی کھڑی رہی...... جیسے مینو کی بات نے ایک بار پھر سے بت بنا دیا تھا۔

☆☆☆

سورج انتہائی آلکسی سے اونگھ رہا تھا۔

ویک اینڈ پر "احمد اللہ خلیل مرحوم" کے گھر میں اگرچہ خوب رونق جمتی لیکن کافی دیر بعد...... ابھی امی یعنی حسینہ اور دادی شاندانہ بی بی اٹھ چکی تھیں۔ امی

کچن میں دادی کے لیے ناشتا تیار کر رہی تھیں اور دادی اشراق پڑھنے کے بعد اپ فریم اٹھائے سرخ دوپٹے پر سلمہ ستارے ٹانک رہی تھیں......

اس دوپٹے کو وہ پورے چار مہینے سے کاڑھ رہی تھیں ہر ٹانکے پر وہ دعا کرتیں۔

"اللہ میرے مجتبیٰ کو ایک چاند سی بیوی عطا فرما۔"

اور کوئی ان سے پوچھتا کہ یہ دوپٹہ وہ کس کے لیے کاڑھ رہی ہیں، تو وہ کہتیں۔

"یہ میرے مجتبیٰ کی دلہن کے لیے ہے۔ یہ بیچ والی جگہ میں نے اس خوش نصیب کے نام کے لیے چھوڑی ہے۔ یہاں میں سنہری دھاگوں سے اس کا نام لکھوں گی۔ بس اللہ مجھے وہ دن دیکھنا نصیب فرمائے۔ یہی میری اس ڈھلتی زندگی کی آخری خواہش ہے۔"

معاً حیدر کے رونے کی آواز پر ان کے جھریوں زدہ ہاتھ تھمے اور انہوں نے مڑ کر دیکھا تو مجتبیٰ اس کو گود میں اٹھائے باہر نکل رہا تھا۔ دادی کے چہرے پر حیدر کو دیکھتے ہی ایک مہربان مسکراہٹ پھیل گئی اور انہوں نے اپنا فریم سائیڈ پر رکھا اور ہاتھ پھیلا کر حیدر کو گود میں لے لیا۔

"وائی زما زڑگیا! (میرے دل) زما خوگ زڑگیا!" دادی اس کا ماتھا چومتی رہیں۔

مجتبیٰ مسکراتا ہوا کچن گیا اور پانی چولہے پر رکھ کر اس میں فیڈر رکھا۔ امی پراٹھا بنا رہی تھیں، مڑ کر اس کو منع کرنے لگیں۔ "میں بنادوں گی بیٹا فیڈر۔"

"نہیں امی! خیر ہے کوئی بات نہیں۔ آپ ناشتہ بنائیں دادی کے لیے...... بلکہ میرے لیے بھی...... اب اٹھ چکا ہوں تو...... ویسے بھی نیند نہیں آئے گی۔" وہ نرم لہجے میں کہتا، حیدر کے لیے دودھ گرم کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد جب وہ فیڈر بنا کر باہر نکلا تو ڈھائی سالہ حیدر نیچے بیٹھا کھلونے والا جہاز ہاتھ میں پکڑا اڑا رہا تھا اور دادی اس سے ایسے باتیں کر رہی تھیں کہ جیسے وہ ان کی باتیں سمجھ رہا ہو۔

"حیدر...... بیٹا آؤ ادھر......" وہ حیدر کو گود میں اٹھا کر دادی کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ حیدر اب جہاز بھول کر فیڈر پی رہا تھا۔ مجتبیٰ کی نظریں فریم میں پھنسے دوپٹے پر پڑیں تو اس نے "پھر سے دادی؟" والی نظروں سے دیکھا اور دادی اس کی نظریں پڑھ کر کہنے لگیں۔

"مان جاؤ ناں مجتبیٰ! کرلو شادی۔ دوسری شادی میں کیا قباحت ہے۔ اتنے مرد کرتے ہیں دوسری شادی۔ اپنے لیے نہ سہی، حیدر کے لیے......" دادی کے لہجے میں منت بھی، درخواست بھی اور...... ایک نادیدہ دکھ بھی...... جواپنے خوب صورت، حسین جواں پوتے کو دیکھ کر ان کے دل میں کسی سوئی کی طرح چبھ جاتا تھا۔ "دیکھو! میرا دوپٹہ بھی مکمل ہونے لگا ہے!"

ان کے چہرے پر ایک ہی بات بار بار سننے کے بعد والی ناگواری چھا گئی۔

"بس یہ دوپٹہ حفیظ لالہ کے بیٹوں کے لیے سنبھال کر رکھ دیں۔" مجتبیٰ ہنسا تھا اور یہ آخر میں ہنسنے کی وجہ، اپنے لہجے کی کڑواہٹ کو اس میں چھپانا مقصود تھا۔ ورنہ روز روز ایک ہی بات کی رٹ نے اس کو حد درجہ بیزار کیا ہوا تھا۔ جانے اس گھر کے مکینوں کے پاس ڈسکس کرنے کے لیے "اس کی شادی" کا موضوع ہی بچ گیا تھا کیا؟۔

اور یہ سچ تھا کہ ان کے پاس بس یہی موضوع تھا۔ گھر کے ہر فرد کی زندگی، معمول پر آچکی تھی۔ سب پھر سے تین سال پہلے کی طرح ہنسی خوشی رہ رہے تھے۔ چھٹکے چھوٹنے جاتے، آؤٹنگ کے لیے جاتے، حفیظ لالہ کے پورشن میں سرد راتوں کو بون فائر کروائے جاتے، باربی کیو کرواتے یا پھر سیما آپا کی طرف بنا بلائے دعوت پر نکل جاتے...... سب کی زندگیاں ویسی ہی تھیں، جیسے تین سال پہلے کے حادثے سے پہلے تھیں۔

سوائے مجتبیٰ خلیل کے...... جس کی زندگی میں ٹھہراؤ آچکا تھا۔ اس کے رویے سے، اس کی عادتوں تک میں ایک جمود آچکا تھا۔ پورے گھر کا شوخ وزندہ دل لڑکا، ایسا خاموش ہو چکا تھا کہ جیسے وہ کبھی زندگی میں ہنسا ہی نہ ہو۔ اور اس سب کے پیچھے کی

وجہ ”کائنات“ تھی......اس کی بیوی......

مرحوم......کائنات‘ اس کی بڑی بھابھی صدف (حفیظ لالہ کی بیوی) کی چھوٹی بہن تھی اور اس کی چچازاد ۔دونوں میں اچھی خاصی دوستی تھی۔ الگ الگ اسکول اور کالجز میں‘ لیکن ایک ہی کلاس میں پڑھنے والے دو دوست......جن میں ہمیشہ مقابلہ ہوتا تھا اور اس کے لاپروا‘ بےفکرے پن کی وجہ سے ہمیشہ کائنات جیت جاتی تھی۔ وقت تیزی سے بدلا‘ ان کی منگنی ہوگئی اور پھر شادی......شادی کے دوسرے ماہ ہی ان کو خوش خبری ملی ۔یہ مجتبیٰ کے بی ایس کا لاسٹ سمسٹر تھا اور کائنات نے سمسٹر فریز کروایا تھا۔ یہ نو ماہ ان کی زندگی کی خوشیوں سے بھرے دن تھے۔ وہ اس کا خوب خیال رکھتا تھا اور شائستہ بھابھی (ارسلان بھائی کی بیوی) اپنے شوہر کو چھیڑتیں‘ اس کی مثالیں دیتیں۔

پھر وہ سیاہ دن اس کی زندگی سے ساری روشنی چھین گیا۔ کائنات کی زچگی میں پیچیدگیاں ہوئیں‘ ڈاکٹرز کو آپریشن کرنا پڑا۔ دادی اور امی خوب رو رہی تھیں ۔صدف بھابھی نے واویلا مچایا ہوا تھا کہ آپریٹ نہ کریں۔ لیکن انہیں کرنا پڑا اور یوں حیدر کو جنم دیتے ہوئے‘ کائنات اس کو دیکھے بنا‘ اس کو خدا حافظ کہے بنا اس دنیا سے کوچ کر گئی۔

اس کے بعد مجتبیٰ ‘ ویسا نہ رہا۔ کچھ مہینے تو وہ کمرے میں بند رہا۔ پھر حیدر کی موجودگی اس کو پگھلانے لگی اور وہ اپنے گرد بنائے خول کو توڑنے لگا۔ یونی ورسٹی سے آکر‘ وہ دو تین گھنٹے حیدر کے ساتھ بتاتا۔ پھر ابو کے ہوٹل کا ایک چکر لگا کر آجاتا اور پھر ساری رات حیدر کے ساتھ بیٹھا کارٹونز دیکھتا‘ اس کو کہانیاں سناتا۔ اس کی غیر موجودگی میں حیدر‘ زیادہ تر اپنی دادی اور پڑدادی کے ساتھ ہوتا۔ پورے گھر کا لاڈلا تھا۔

اگرچہ دو سال تک کسی نے اس کی شادی کا ذکر نہیں کیا لیکن اب ،سب اس کی شادی کے بارے میں بات کرنے لگے ۔ اس موضوع پر اگر کسی کا اختلاف تھا تو وہ صرف مجتبیٰ تھا ،البتہ صدف بھابھی شروع سے ہی اپنی بہن کی جگہ کسی اور کو لانے کی سوچ پر خوب غصہ ہوتیں اور دکھی ہو کر رو پڑتیں۔ لیکن رفتہ رفتہ انہیں بھی احساس ہونے لگا کہ مجتبیٰ تو ابھی لڑکا ہے‘ اس کے آگے ایک لمبی عمر پڑی ہے......!!

ناشتہ ختم کرنے کے بعد ،ایک ایک کر کے سارا گھر والے جاگنے لگے۔ اس سے پہلے کہ ناشتے پر اس کی شادی کا ذکر چلتا‘ اس نے حیدر کو گود میں اٹھایا اور باہر نکل گیا۔ پیچھے دادی اس کو پکارتی رہ گئیں۔

☆☆☆

”اللہ بخشے میری ماں کو......ایک دفعہ پڑوس کی شمیم باجی کی پہلی بیٹی کی پیدائش پر انہوں نے شمیم سے کہا تھا اللہ تمہیں ایک اور بیٹی بھی دے تاکہ اس بچی کی ایک رازداں ہو۔ دونوں ایک دوسرے سے اپنے دل کی بات کہہ سکیں ۔ یہی بات انہوں نے بلوشہ کی پیدائش پر بھی کہی اور پھر تو زیتون بھابھی نے اس پر اتنی سنجیدگی سے عمل کیا کہ بیٹیوں کی ایک لائن لگا دی ...... یوں جیسے پورے ملک کی بیٹیوں کے راز رکھنے کا فریضہ ملا ہو میرے بھائی کو......“

یہ تقریر نما کڑوی کسیلی باتیں‘ رخشندہ پھپھو کی تھیں اور یہ نہیں تھا کہ یہ تاریخی تقریر انہوں نے کسی خاص موقع پر کی تھی ، یہ وہ تقریباً ہر جگہ‘ ہر محفل میں کیا کرتیں ...... جب جب زیتون اور اس کی سات بیٹیوں کی بات چھڑتی۔

”ماسٹر فراز کی زندگی بھی جہنم بن چکی ہے‘ اللہ معاف کرے۔ اتنی مہنگائی میں تین نہیں سات سات لڑکیوں کو پالنا جن کو پرایا ہونا ہی ہے۔ اور سونے پر سہاگہ ساری کی ساری لڑکیاں پڑھائی بھی کر رہی ہیں۔“ کسی خاندان والی پھپھو‘ خالہ کا رحم کھاتا لیکن آخر میں بےزار ہوجاتا لہجہ......

اور ان سب باتوں پر نہ تو ماسٹر فراز کے ماتھے پر شکنیں ابھریں اور نہ ہی زیتون بی بی نے جواب دینا بہتر سمجھا ہو۔ وہ دونوں بہت تحمل سے بات سنتے اور آخر میں اللہ کا شکر ادا کر کے ”بحث تمام شد“ کرتے

لیکن اب یہ ایک دفعہ کی بات ہوتی' تو خیر تھا لیکن یہ تو معمول سا بن گیا تھا۔

حسین خان کے دو بیٹے شاہ جہاں' فراز اور تین بیٹیاں رخشندہ' رخسانہ اور روزینہ تھیں۔ شاہ جہاں اور گل ناز کے دو بیٹے کبیر اور زین تھے جبکہ فراز اور زیتون کی سات لڑکیاں تھیں جن میں پلوشہ کی شادی کبیر اور ماہین کی منگنی زین سے ہو چکی تھی۔

پلوشہ نے پشاور یونی ورسٹی سے مائیکرو بائیو لوجی میں ایم فل کیا ہوا تھا' اس کا آگے بھی پڑھنے کا ارادہ تھا لیکن تائی نے شادی کی تاریخ مانگ لی' اس شرط پر کہ وہ اسے آگے پڑھنے دیں گے لیکن شادی کے ایک مہینے بعد وہ مکر گئیں کہ کبیر کو ایسی لڑکیاں ذرا نہیں پسند۔ ابو کو رشتے کی نزاکت کے آگے خاموش ہونا پڑا' سو پلوشہ کو بھی......

اگرچہ پلوشہ کو تایا اور اس کے بیٹوں کے مزاج کا پہلے سے پتا تھا مگر جو حقیقت اس کو کچھ عرصہ گزارنے پر پتا چلی' وہ انتہائی ناقابل برداشت تھی لیکن اس کو اپنی بہنوں کی خاطر، ہر بری بات برداشت کرنا پڑ رہی تھی۔ تایا فطرتاً کافی غصیلے تھے اور ان کے یہ شارٹ ٹیمپر والی جینز کبیر اور زین میں بھی بدرجہ اتم پائی جاتی تھیں۔ کب کس بات پر ان کا پارہ چڑھ جاتا' پتا نہیں چلتا تھا اور چونکہ فطرت پانی پر تیرتا ہوا کارک ہوتی ہے جس کو جتنا دباؤ' اس کو اوپر آنا ہی ہوتا ہے۔

ان تینوں میں کبیر کچھ زیادہ ہی شارٹ ٹیمپر تھا۔ چائے میں چینی کم ہوتی' سالن میں تھوڑا نمک زیادہ ہو جاتا۔ اس کو شاید بہانہ چاہیے ہوتا تھا غصہ کرنے کا' اپنی فرسٹریشن نکالنے کا۔ اب تو وہ اس پر ہاتھ بھی اٹھانے لگا تھا۔ اس دن غلطی سے اس نے رات کو اس کی نیوی بلیو شرٹ استری کر دی تھی' حالانکہ اس نے سیاہ شرٹ کا کہا تھا۔ پہلے تو کبیر نے اس شرٹ کو چولہے پر رکھا' کچن میں پڑا کولر تڑاخ سے لات مار کر توڑ دیا اور پھر جلتی شرٹ اٹھا کر اس پر پھینکی...... جلتی ہوئی قمیص سے چنگاریاں اس کے دودھیا پیروں پر پڑیں اور نشان ثبت کر گئیں۔

تائی اس کو سمجھاتیں۔

''پلوشے! تم کیوں اس کو غصہ ہونے کا موقع دیتی ہوں۔ دھیان دیا کرو' جو وہ کہتا ہے...... جو وہ چاہتا ہے...... تمہارے تایا کو دیکھو' وہ بھی ایسے ہی تھے۔ اور اب بھی ہیں لیکن اب میں ان کی فطرت کو سمجھ چکی ہوں۔ ان کا خیال رکھتی ہوں' جیسا وہ چاہتے ہیں۔''

آنسوؤں کا گولا اس کے حلق میں پھنسا اور ایک خاموش آنسو کی لکیر اس کے چہرے پر بہنے لگی۔ جب بولی تو اس کی آواز میں منہدم ہوتے شہروں کی وحشت اور ویرانی تھی۔

''کوش...... شش کرتی ہوں' تائی۔ ہر چیز کا خیال رکھتی ہوں۔ اس کا ردعمل کا اتنا شدید ہوتا ہے کہ سوچ کر کچھ نہ کچھ غلط ہو جاتا ہے...... میں کوشش کرتی ہوں......'' آخر میں اس نے کہنا چاہا کہ وہ غلطیاں اتنی بڑی نہیں ہوتیں کہ نظر انداز نہ کی جا سکیں۔ لیکن وہ جانتی تھیں کہ یہ جملہ پھر کبیر کے گوش گزار ہو چکا ہوگا......!!

اس لیے اس نے خاموشی اختیار کرنا شروع کی اور ہر درد چھپانا بھی......! ابھی ابو کے گھر جانے سے پہلے وہ ہر داغ' ہر زخم کو کنسیلر سے چھپا رہی تھی اور ایک مسکراہٹ بھی اپنے چہرے سجاتی تھی۔ جو سب سے مشکل کام تھا۔ انتہائی مشکل۔ اپنا درد چھپا کر مسکرانا' واقعی میں دنیا کا مشکل ترین کام ہوتا ہے کہ آپ چاہتے بھی ہوں کہ لوگ' آپ کا درد سمجھیں لیکن پھر بھی اپنے بھرم اور عزت نفس کی خاطر آپ کو چھپانا پڑ رہا ہو......!!

☆☆☆

''کبیر کیسا ہے' مہینے ہو گئے یہاں چکر لگائے ہوئے۔'' زیتون بی بی' تائی سے پوچھ رہی تھیں جو پلوشہ کے ساتھ دیور کی تیمارداری کرنے آئی تھیں۔ تائی کے چہرے پر تاثرات فوراً بدلے۔

''کیا کہوں' زیتونے! بے چارہ پورا دن خوار ہوتا ہے۔ بینک کی نیجری بھی دماغ خراب کر دیتی ہے۔ اتنا حساب کتاب کرتے دیکھا نہیں ہے لوگوں کی لائنیں لگی

ہوتی ہیں بینکوں میں۔اس دن گئی تھی ہسپتال میں۔ دیکھا تھا میں نے کتنا رش ہوتا ہے۔" آخری جملوں میں ان کا لہجہ ایسا ہو گیا کہ لمحے بھر میں وہ دنیا کی سب سے لاچار اور بیمار عورت بن گئی ہوں۔

"مجھے اندازہ تھا کہ تائی نے اپنی ہمدردی بٹورنے کے لیے کچھ نہ کچھ کہہ دینا ہے۔" مینو ہنسی تھی اگرچہ اس کا لہجہ طنزیہ تھا۔ کچن کی کھڑکی باہر صحن میں کھلتی تھی، جہاں چارپائی پر لیٹے ابو اور پاس دوسری چارپائی میں تائی اور امی بیٹھی تھیں۔ پلوشہ مینو کے ساتھ کچن میں کھڑی چائے بنا رہی تھی۔

"خیر تو تھی ناں بھابھی جان؟ ہسپتال کیوں گئی تھیں۔" امی نے تائی سے پوچھا تائی کو تو موقع چاہیے تھا۔

"لو تمہیں پلوشہ نے نہیں بتایا کچھ؟ سارا دن تو اس مینو کے ساتھ موبیل (موبائل) پر لگی ہوئی ہوتی ہیں گھر کی سیکنڈ سیکنڈ کی بات بتاتی رہتی ہے۔ یہ نہ ہوسکا کہ تائی کی صحت کا بھی بتا دے۔ بھئی نیک بخت! جتنا میں اس کو بیٹی سمجھتی ہوں، قسم سے اگر اس نے مجھے ماں سمجھا ہو بھی۔" تائی کا لہجہ روہانسا ہوا اور آخر میں آواز دھیمی کر کے، دوپٹے کا پلو منہ پر رکھ کر چند سسکیاں بھریں۔

"اور یہ ملتا ہے...... ساس کی خدمتیں کرنے والی بہو کو ان کی طرف سے نوبل پرائز!" مینو نے صحن کی اور ہاتھ پھیلا کر کے، کورنش بجالانے والے انداز میں پلوشہ کو کہا، جس کا چہرہ لمحے بھر میں تاریک ہو چکا تھا۔

"ارے، ارے بھابھی جان۔ ایسا نہیں ہے۔ اس پورے ہفتے میں اس کی طرف سے کوئی فون تک نہیں آیا، میں کل مینو کو کہہ رہی تھی کہ ذرا خبر لو کہ میری بیٹی کس حال میں ہے، ایک ہفتے سے بات نہیں ہوئی۔" امی نے ان کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر تسلی دی، جو کہ ایک اور انگارہ ثابت ہوئی۔

"کیوں زیتون بی بی؟ کس حال میں ہوگی کا کیا مطلب؟ ہم نے کیا باندی بنا کر رکھا ہے خدانخواستہ۔"

"یا خدایا گل نازے خور! یہ کیا آپ ہر بات کو نئی رنگ دیئے جا رہی ہیں۔ بچی ہے، بھول گئی ہوگی۔ ہم تیمارداری کرنے نہ آئے، خیر ہے کوئی بات نہیں۔ وہ تو آپ کی خدمتیں کرتی رہی ہوں گی نا۔ اپنی تربیت پر یقین ہے مجھے اتنا۔" ابو جو اتنی دیر تک خاموش بیٹھے تھے بولے اور ان کا بارعب لہجہ نا چاہتے ہوئے بھی تائی کو خاموش کر گیا۔ چند لمحے خاموشی رہی اور پھر ابو خود ہی اٹھ کر کمرے میں چلے گئے، جاتے سمے انہوں نے کچن میں سر جھکائے خاموش کھڑی پلوشہ کو دیکھا، جس کی آنکھوں میں اداسی ہی اداسی تھی۔

"ابو کو بھی کیا سوجی تھی، اس مینٹل سائیکم جیسے گھر میں رشتے کرنے کی؟" مینو نے کڑھ کر اس سے پوچھا، وہ ٹرے میں چائے کے کپ رکھ رہی تھی۔ معاً اس کے ہاتھ سے کپ پھسلا، اور چھناکے کی آواز کے ساتھ فرش پر گر کر چکنا چور ہو گیا۔ مینو جو جھک کر کرچیاں سمیٹ رہی تھی، رک کر حیرت سے پلوشہ کو دیکھنے لگی۔ جو سہم کر دیوار سے لگی، لمبی لمبی سانسیں لے رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں وحشت، چہرے پر خوف تھا اور مینو یک ٹک اس کے پیروں پر لگے کینسلر کو دیکھے جا رہی تھی۔

☆☆☆

"کبیر بھائی آپ کو مارتے ہیں؟" مینو بے یقینی سے اس کے سامنے بیٹھی تھی جس کا سر یوں جھکا تھا کہ جیسے وہی مجرم تھی۔ تائی کو چائے دینے کے بعد وہ ہاتھ پکڑ کر اس کو کمرے میں لے آئی، اور اس کے کنسیلر زمٹا کر اس کے داغ کو یک ٹک دیکھے جا رہی تھی۔ "کب سے چھپا رہی ہو یہ سب پلوشہ باجی؟"

پلوشہ کا ذہن کئی بہانے تراش رہا تھا، جیسے یہ چائے گر گئی تھی اور سبزی کاٹتے ہوئے ہاتھ کٹ گیا اور بال اسٹریٹ کرتے ہوئے گردن جل گئی تھی۔ لیکن جانے کیوں، ہر بہانہ اس کی زبان پر دم توڑ رہا تھا۔

"میں ابو کو بتاؤں گی یہ سب۔ کس حق سے وہ یہ سب کر رہا ہے؟" غصے سے کہتی مینو اٹھی، پلوشہ نے فوراً اس کی کلائی تھامی۔ مینو کی نظریں اپنی کلائی سے

ہوئی ہوئی، اس کے چہرے تک گئیں۔ اس کی آنکھیں منت کر رہی تھیں۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ ایسی کوئی بات ہو جو اس کی بہنوں کے لیے رکاوٹ کا باعث بنے۔

"پلیز! مینو...... ایسا کچھ نہیں ہے...... تم بلاوجہ بلکہ سوچ کر اس کو ایگزیجریٹ کر رہی ہو۔ ابو کی طبیعت ویسے بھی خراب ہے مینو، ان کی ای سی جی رپورٹ قابل تشویش ہے۔ ایسا کچھ مت کہنا تم، پلیز میں ٹھیک ہوں۔" اس نے جتنی بھی کوشش کی اپنا لہجہ مضبوط بنانے کی، آخر میں اس کا لہجہ ٹوٹ ہی گیا۔

مینو نے خفگی سے اپنا ہاتھ جھٹکا تھا اور ناراضی سے منہ پھیر کر بیٹھ گئی۔ بلوشہ کے جانے تک، مینو نے اس سے ایک بات تک نہ کی۔ جو کہ امی نے بھی محسوس کیا اور کبیر نے بھی...... جورات کو اس کو لینے آیا تھا۔

گاڑی میں بیٹھنے کے بعد وہ ناگواری سے اس سے پوچھ رہا تھا۔ "یہ مینو مجھے ایسے ناگواری سے کیوں دیکھ رہی تھی؟"

بلوشہ نے کھڑکی کے پار دیکھتے ہوئے، کھوئے ہوئے لہجے میں کہا تھا۔ "ابو کی طبیعت کی وجہ سے کافی چڑچڑی ہو گئی ہے شاید۔ مجھ سے بھی بات نہیں کی اس نے پورا دن۔"

کبیر "ہونہہ" کہتا سامنے دیکھنے لگا اور وہ دور اس بچے کو دیکھ رہی تھی، جو گاڑی کے سامنے کھڑا اس مسکراتے کپل کو گجرے خریدنے کے لیے اکسا رہا تھا اور وہ اس بچے سے ہنسی مذاق کر رہے تھے۔ وہ آدمی اب خوب صورت گجرا لے کر اپنی بیوی کی دودھیا کلائیوں میں پہنائے گا اور اس کی بیوی کا چہرہ شرم سے لال ہو جائے گا...... شاید وہ لاڈ سے مسکرا بھی دے......

وہ محرومی سے سوچے جا رہی تھی۔

☆☆☆

"کیا مطلب گجرے نہیں لوگے میرے لیے؟" یک ٹک اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی...... جن میں شرارت چھپی تھی۔

مجتبیٰ کی نظریں گجرے والے بچے کی تلاش میں گھوم رہی تھیں۔ ہونٹوں پر دبی دبی مسکراہٹ اور پورے پشاور کی روشنیاں سمیٹے آنکھیں مڑ کر اس کو دیکھنے لگیں، جو منہ بسورے ہوئے تھی۔ کتنی کیوٹ لگ رہی ہے، اس نے سوچا تھا۔

"گجرے لینے کی لاجک کیا ہے اور...... اور بیگم میں ایک غیرت مند پختون ہوں۔ بیوی کو گجرے پہناؤں گا؟" ابرو اچکا کر طنز میں ڈوبا لہجہ۔ کائنات کو تو مانو آگ ہی لگ گئی۔

"اس غیرت مند پٹھان کی غیرت کہاں مر گئی تھی؟ جو نکاح سے پہلے کیک لایا کرتا تھا چھپکے چھپکے؟ جو بھی ہو...... مجھے تو گجرے چاہئیں...... بس......!!" کائنات کا چہرہ غصے سے لال تھا۔ وہ اس کے تاثرات دیکھ کر ہنس پڑا اور اسی وقت اس کو گجرے والا بچہ دکھ گیا......

"رورا (بھائی)! سگنل کھل گئے ہیں۔" پیچھے سے عجلت بھرے انداز میں بجتے ہارن اور شیشہ بجاتا ٹریفک والا اس کو یوں جیسے عالم تنویم سے گھسیٹ کر لے آیا۔ وہاں ایک نیا بچہ ہاتھ میں گجرے لیے کھڑا تھا۔ ایک دکھ بھری مسکراہٹ اس کے چہرے پر پھیل گئی۔ برابر میں دیکھا تو حیدر کا ٹیبلٹ آن تھا اور وہ سو چکا تھا۔

وہ حیدر کو رنگ روڈ پر نیا نیا بنا 'وی پلے' گھمانے لایا تھا۔ گھر کے باقی بچے امینہ بھابھی (مرتضیٰ بھائی کی بیوی) کے بھائی کی منگنی میں گئے تھے۔ چونکہ امی نہیں گئیں تو اس نے صدف بھابھی کے کہنے پر بھی حیدر کو نہیں بھیجا کہ اس کا خیال کون رکھ پائے گا منگنی میں...... اور مزید بھابھی کا ایونٹ بھی سپوائل ہو جائے گا...... تو وہ اس کو وی پلے لے کر آ گیا۔ حیدر نے خوب انجوائے کیا۔

گھر آیا تو سب بیٹھے ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ صدف بھابھی تیار کھڑی، حفیظ بھائی سے تصویریں کھنچوا رہی تھیں اور باقی بھابھی کی فوٹو شوٹ دیکھ رہے تھے وہ ان کے اسٹائل پر خوب لوٹ پھوٹ ہو رہے تھے۔ وہ ہلکا سا مسکرا کر حیدر کو سلا کر نیٹ فلیکس لگا کر بیٹھ گیا۔

لوگ کہتے ہیں' وقت زخم بھر دیتے ہیں' لیکن ایسا وہ نہیں سوچتا تھا۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ اس کا زخم ہرا ہوتا۔ کائنات کی ہنستا مسکراتا چہرہ' ایک پل کے لیے اس سے نہیں بھولتا تھا۔ جب جب وہ حیدر کو دیکھتا' اس کے سامنے کائنات آکھڑی ہوتی ۔ یہی وجہ تھی کہ وہ دوسری شادی کے بہت خلاف تھا ۔ اگر وہ عورت اس کو حیدر سے دور کردے' اور روایتی سوتیلی ماؤں کی طرح اس کے ساتھ برا کرے ...... جس کی بھی اس کو خبر ہی نہ ہو اور اس کا بیٹا چپ چاپ سفر کرے......

کائنات کو کتنا دکھ ہوگا؟ کیا وہ اس کو پھر معاف کردے گی؟۔ ایک بار پھر وہ اپنے احتسابی کٹہرے میں کھڑا تھا۔ اس کا دل اچاٹ گیا اور اس نے لیپ ٹاپ بند کردیا۔ اسی وقت امی دروازہ کھٹکھٹا کر اندر داخل ہوئیں تو ان کے ہاتھ میں چائے تھی۔

''کیسا رہا دن؟'' امی اس کو چائے پکڑا کر نرم لہجے میں پوچھ رہی تھیں۔

''اچھا رہا امی...... حیدر نے خوب انجوائے کیا ......''

امی کچھ دیر بیٹھی رہیں' پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر نرمی سے دبایا اور وہ سمجھ گیا کہ وہ آگے کیا کہنے والی تھیں۔

''مجتبیٰ! اب تو مان جاؤ...... دیکھو حیدر ابھی چھوٹا ہے۔ ضروری نہیں ہے کہ ہر سوتیلی ماں کہانیوں اور ڈراموں کی طرح ظالم اور......'' امی کا لہجہ نم ہو رہا تھا۔

مجتبیٰ نے ان کی بات بیچ میں کاٹی۔ ''امی پلیز let not discuss this! ...... میں بہت تھک گیا ہوں' نیند آرہی ہے۔''

امی نے دکھ سے دیکھا اسے اور پھر کپ اٹھا کر باہر نکل گئیں۔ ساری رات وہ کائنات کی یادوں میں جاگتا رہا۔ صبح نماز پڑھ کر سویا کہیں......!

☆☆☆

شام کی نیلگوں روشنیاں ہر سو پھیلی ہوئی تھیں۔ وہ تائی کے ساتھ بازار گئی تھی۔ اس نے یہ سوچ کر بازار سے ہی کھانے کی کچھ چیزیں خریدیں کہ شاید کبیر آچکا ہو۔ جیسے ہی وہ لوگ گھر پہنچے' کبیر واقعی میں آچکا تھا۔

''کہاں گئی تھیں تم؟''

اس کا لہجہ اس کے برے موڈ کا غماز تھا۔

''تائی کے ساتھ بازار......'' اتنا کہہ کر وہ اس کے دور پھینکے گئے جرابیں' ٹائی اور جوتے سمیٹ کر اپنی جگہ پر رکھنے لگی۔ کبیر نے اس کے بعد جواب میں کچھ نہیں کہا اور وہ بھی اس کے کپڑے نکال کر کچن آگئی۔

جلدی سے سلاد بنا کر پلاؤ اور کڑھی نکال کر وہ اپنے کمرے چلی آئی۔ تائی شام کی نماز پڑھ رہی تھیں ۔ کبیر نے ٹرے میں سجا بازار کا کھانا دیکھا اور پھر اس کو مڑ کر دیکھ کر پوچھنے لگا۔

''یہ کیا ہے؟''

''تائی نے کہا تھا کہ بازار سے کھانا لیتے جائیں گے' پھر اتنا ٹائم نہیں ہوگا ...... کھانا بنانے کا......'' اس کی آواز کبیر کے بدلتے تاثرات دیکھتے ہوئے دھیمی پڑنے لگی۔ دلیل دیتی آواز آخر میں جرم قبول کر چکنے والی مجرم آواز بن گئی۔

ایک استہزائیہ ہنکارا بھر کر کبیر نے اس کو دیکھا۔ ''تائی نے کیا کہا تھا؟''

''کہ...... بازار سے......'' اس سے جملہ مکمل نہیں ہو پا رہا تھا۔ اس کا نچلا ہونٹ لرزنے لگا۔

کبیر نے ٹرے کو ہاتھ مار کر گرایا۔ ''تائی نے یہ کہا تھا' تائی نے وہ کہا تھا۔ کس اسلام میں یہ کہا گیا ہے کہ بیوی کوئی بھی کام کرنے سے پہلے شوہر کے بجائے ساس کی اجازت لے گی؟''

کبیر کے گلے کی رگیں ابھریں اور چہرہ سرخ پڑنے لگا۔ پلوشہ کا نچلا لب لرزنے لگا۔ کبیر کے غصے کی آواز سن کر تائی بھی چلی آئیں۔ پلوشہ نے مڑ کر تائی کو مدد چاہتی نظروں سے دیکھا تائی آگے بڑھیں۔

''کیا ہوا ہے؟ کیوں غصہ ہو رہے ہو؟''

تائی ایسے سوال کر رہی تھیں کہ جیسے ان کو اپنے بیٹوں کی فطرت کا پتا نہیں تھا۔ پلوشہ سر جھکائے اپنے آنسو پینے لگی۔

"پوچھیں اس سے...... پوچھا تھا اس نے مجھ سے کہ یہ بازار جائے؟ اور...... بندہ سارا دن تھک ہار کر گھر سکون کے لیے آتا ہے۔ بازاری کھانوں سے بچنے کے لیے صبح سے لے کر شام تک بھوکا رہتا ہے...... کہ گھر کا پکا ہوا کھانا کھائے گا۔ لیکن یہاں محترمہ، اس پھوہڑ ناکارہ عورت کو ذرا اگر کھانا بنانا آتا ہو۔ اور اس پر یہ کہ بازار سے لے آئی ہے کھانا...... اب یہ نئی عیاشی سیکھ لی۔" وہ غصے سے چلا رہا تھا اور بات کرتے کرتے پلوشہ کی طرف یوں بڑھتا جیسے اس کو مارنا چاہ رہا ہو...... تائی اس کے سامنے آ کھڑی ہوئیں اور اس کو بازو سے پکڑ کر پیچھے کیا۔

"غصہ تھوکو میری جان۔ کوئی بات نہیں۔ جاؤ پلوشہ جلدی سے لو یہ پکالو اور کچھ سیخ کباب بھی فریج رکھے ہیں، انہیں بھی تل دو۔" تائی بیٹے کو شانت کرنے کے بعد اس کو ہدایات دینے لگیں۔

وہ فوراً سے بیشتر کمرے سے باہر نکلی اور روتے ہوئے کچن میں کھانا تیار کرنے لگی۔

کچھ دیر بعد تائی بھی کچن میں داخل ہوئیں۔

"دیکھو پلوشہ بیٹا۔ اس کو بازار کے کھانے پر غصہ نہیں تھا۔ تمہارے اس سے اجازت نہ لینے پر تھا۔ اگلی بار اس سے اجازت لے کر جانا۔" تائی اس کو گلے کر دلاسہ دے رہی تھیں۔ بجائے اس کے، کہ تائی اپنے "غیرت مند" بیٹے کو کہتیں کہ میرے ساتھ گئی تھی...... وہ الٹا اس کو سمجھا رہی تھیں......

مینو ٹھیک کہتی تھی۔ تائی کبھی غلطی نہیں مانتیں، ہمیشہ وکٹم بنتی ہیں۔

"اچھا پلوشہ...... میں یہ لے کر جاتی ہوں، تم میرے شہزادے کے لیے ایک کپ چائے بنا دو کڑک سی......" تائی ٹرے اٹھا کر اس کو ایک نیا آرڈر دے کر چلی گئیں۔

وہ چائے چڑھا کر بالکل اس کے سامنے بت بنی کھڑی رہی...... کیا اس کی عادی ہو گئی۔

☆☆☆

آج سیما آپا آئی تھیں اور ان کی بیٹیاں بھی...... گھر میں خوب رونق تھی۔ رات کو سب نے باربی کیو کا پروگرام بنایا۔ صدف بھابھی چائے بنا کر سرو کر رہی تھیں۔ حفیظ لالہ تکوں کو مسالا لگا رہے تھے، ارسلان بھائی ان تکوں کو سیخ میں پرو رہے تھے۔ ایسے موقعوں پر جب سارا خاندان اکٹھا ہوتا اور ایسے پروگرام بنتے تو اس کے سارے کام مرد کرتے تھے۔

دادی حیدر کو گود میں سلائے ہوئے، اپنی بہن سے فون پر بات کر رہی تھیں اور باقی خواتین سیما آپا کے گرد بیٹھی، ان کی نند کی متوقع شادی اور سسرال کے بارے میں محو گفتگو تھیں۔

مجتبیٰ دور بیٹھا، انسٹا اسکرول کر رہا تھا۔ اس کو پی ایچ ڈی کے لیے اپلائی کرنا تھا۔ کسی دوسرے ملک نہ سہی، قریب پشاور یونی ورسٹی میں ہی کر لینا چاہیے۔ وہ سوچ رہا تھا۔

"چائے؟" صدف بھابھی اس کو چائے دے رہی تھیں۔

"نہیں بھابھی، شکریہ۔ موڈ نہیں ہے۔" وہ لحظے بھر کے لیے مسکرایا۔ اگرچہ اس کا موڈ یہاں بیٹھنے کا بھی نہیں تھا لیکن یہ وہ امی کے لیے کر رہا تھا تاکہ خفا نہ ہو۔

"مجتبیٰ! ادھر آؤ ذرا...... آگ لگانے میں ہیلپ کرو۔" مرتضیٰ بھائی اس کو مدد کے لیے بلا رہے تھے۔

"مرتضیٰ بھائی! غلط انسان کو بلا رہے ہیں آپ۔ یہ کام تو آپ کی زوجہ بخوبی کر سکتی ہیں۔" شائستہ بھابھی ہنس کر بولیں۔ (شائستہ اور امینہ بہنیں تھیں)

"نہیں ناں، ان کی یہ صلاحیت خاص موقع کے لیے پریزورکی ہوئی ہے۔" امینہ بھابھی سے پہلے مرتضیٰ بھائی نے جواب دیا۔

وہ مرتضیٰ بھائی کے ساتھ بیٹھ کر لکڑیاں جلانے

لگا۔ سیما آپا نے اس کو قریب دیکھا' تو امی سے کہنے لگیں۔

"امی! شمع کی شادی میں ایسی خوبصورت لڑکی دیکھی ہے ناں۔ آپ دیکھیں گی تو اش اش کر اٹھیں گی۔ ایسا حسین سراپا' نیلی آنکھیں' گوری رنگت۔ اور سونے پر سہاگہ یہ کہ ایم فل کر چکی ہے انگلش لٹریچر میں۔" سیما آپا اب موبائل کھول کر ان کو تصویر دکھا رہی تھیں اور ساری خواتین سب کچھ بھول بھال سیما آپا کے گرد دائرہ بنا کر تصویر دیکھنے لگیں۔

وہ ضبط کر کے یوں بیٹھا رہا کہ جیسے بہرہ ہو۔ معاً سیما آپا موبائل لے کر اس کے پاس آئیں اور اس کو تصویر دکھانے لگیں۔ "دیکھو...... کتنی پیاری ہے...... میں نے تو اس کے گھر میں بات تک......"

اس کے ضبط کا پیالہ چھلکا اور وہ آپا کا ہاتھ جھٹک کر اٹھا۔

"فار گاڈ سیک! بس کر دیں۔ چھوڑ دیں مجھے اکیلا۔ نہیں کرنی مجھے شادی۔ آپ سب اپنی ہمدردی اپنے پاس سنبھال کر رکھیں۔ گھر کے ہی کیلکو دیکھ کر میرے لیے فکر مند ہونا چھوڑ دیں۔ میں اپنی زندگی میں ٹھیک ہوں۔ کیوں ایک بات کی رٹ لگا رکھی ہے۔" وہ غصے سے تن فن کر کے باہر نکل گیا۔ سب تاسف سے اس کو جاتا دیکھتے رہ گئے۔ ارسلان بھائی اس کے پیچھے نکل گئے۔

"سیما غلط جگہ بات چھیڑ دی۔" دادی ناگواری سے سیما آپا کو کہہ رہی تھیں اور سیما آپا جو پہلے تو اس کے رویے پر خفا ہو چکی تھیں۔ اب برا فیل کر رہی تھیں۔ ان کو واقعی میں ایسے موقع پر یہ موضوع نہیں چھیڑنا چاہیے تھا۔

☆☆☆

"دو سال ہو گئے ہیں' گل ناز بے! ابھی تک گھر میں بچے کی قلقاریاں سنائی نہیں دے رہیں۔ کسی ڈاکٹر کو دکھاؤ۔ یہ پشاور میں شیر پاؤ کے پاس ہی ڈاکٹر فوزیہ ہے۔ اتنی قابل ڈاکٹر۔ میری نند نے جب سے اس سے علاج کروایا ہے' تب سے ماشاءاللہ تین بیٹے ہیں اس کے۔" رخشندہ پھپھو' تائی کی تیمار داری کے لیے آئی ہوئی تھیں اور ان کو مشورے دے رہی تھیں۔ بالخصوص یہ بات انہوں نے تب چھیڑی' جب انہوں نے سامنے سے پلوشہ کو آتے دیکھا۔

وہ چائے رکھتی' پاس ہی بیٹھ گئی۔

"جانے کیسی قسمت پائی ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ شادی کے بعد لڑکے ٹھیک ہو جاتے ہیں۔ نیم جیسے کڑوے' شہد میں بدل جاتے ہیں۔ ایک میرا بیٹا ہے جو ہر گزرتے دن پلوشہ کی غلطیوں و نادانیوں کی وجہ سے کڑوا اور چڑچڑا ہوتا جا رہا ہے۔" تائی نمناک لہجے میں کہہ رہی تھیں۔ پلوشہ کا ان کی بات پر آن کی آن میں چہرہ سرخ پڑ گیا اہانت سے۔ رخشندہ پھپھو نے ناگواری سے اس کو دیکھا۔

"اے پلوشے! تم ایسے کام کرتی کیوں ہو کہ شوہر غصہ ہو؟ مرد تو ہوتے ہی غصیلے اور بالخصوص پختون۔ آج کل کی لڑکیاں ایسی ہیں کہ ادھر کچھ بولا نہیں اور آنسو آنکھوں میں محفل سجا بیٹھتے ہیں۔ بھئی' ہم نے تو اتنی ماریں کھائیں' لیکن دیکھو اپنی قابلیت اور سگھڑپن سے کیسے ان کی عادتوں کو بدلا ہم نے۔ تم بھی بیٹا ذرا خیال رکھا کرو شوہر کا۔" رخشندہ سمجھانے والے انداز میں کئی تیر چھوڑ کر' اب چائے کی چسکی لینے لگیں۔ "اے بیٹا' اتنی چینی ڈال دی ہے۔ خوب پتا ہے کہ مجھ بڑھیا کو شوگر ہے۔"

رخشندہ پھپھو کی شکایت پر اس نے تائی کے چہرے پر ناگواری دیکھی' جو رخشندہ پھپھو کو نظروں میں کہہ رہی تھیں کہ ...... "دیکھا؟" اور بجائے اس کے وہ کہتی پھپھو میں نے تو اس میں چینی ڈالی ہی نہیں ہے۔ اس نے نرم لہجے میں کہا۔

"لائیے' میں نئی چائے بنا کر لاتی ہوں۔"

رخشندہ پھپھو اس کو چائے پکڑا کر' تائی سے نظروں میں بات کرنے لگیں۔ جب وہ کچن میں چلی گئی تو ناگوار لہجے میں کہنے لگیں۔

"بھئی! بر حق غصہ کرتا ہے کبیر۔"

☆☆☆

اگرچہ یہ اولاد کا طعنہ پہلی بار نہیں ملا تھا اور نہ ہی وہ پہلی بار کسی گائناکولوجسٹ کے پاس گئی تھی۔ تائی بہت پابندی سے اس کو نت نئے ڈاکٹرز سے علاج کروانے لے جایا کرتی تھیں اور یہ سلسلہ شادی کے دوسرے مہینے سے شروع ہوا تھا۔

مینو کو یہ بات بہت بری لگتی۔ ''آپ ایجوکیٹڈ جاہل ہو پلوشہ باجی! ابھی تو شادی کو ایک سال نہیں ہوا اور آپ نے علاج شروع کر دیا ہے...... بریسلی؟ وہ 'ریسرچ کی عادت' کہاں گئی جو ہر چیز پر گھنٹوں ریسرچ کرتی تھیں؟''

''مینو! شادی کے بعد ساری ترجیحات بدل جاتی ہیں پھر جب ایسے معاشرے میں رہ رہے ہو آپ' جہاں بڑوں کی چلتی ہیں یا پھر شوہر کی۔''

اس کے جواب پر مینو طنزیہ ہنکارا بھرتی' پھر افسوس سے اس کو کہتی کہ' آپ دیوار بن چکی ہو۔ ساکت' جامد۔''

اور وہ کسی حد تک ٹھیک بھی تھی۔ ہر کسی نے اس کو اس کی بہنوں کو یہ طعنے دیے ان کے باپ پر کتنی بڑی بوجھ ہیں۔ سات بہنوں کا بوجھ۔ پڑھانا لکھانا تو چھوڑو ایک سرکاری اسکول کے ٹیچر کی تنخواہ میں اتنا بھرا پرا گھر سنبھالنا۔ سوان کے جہیز کا بوجھ' جہاں جہیز اتنا بنایا جاتا ہے کہ جتنا ایک نئے گھر کا پورا سامان......!

وہ سب کچھ بس اس لیے سہہ رہی تھی کہ ایسا نہ ہو' کہ وہ ایسا قدم کبھی نہ اٹھائے جو کہ بہنوں کے لیے طعنہ نہ بن جائے ......اور ان کے رشتوں میں رکاوٹ نہ ہو۔

مینو اس پر کڑھتی تھی۔

امی اس پر خاموش تھیں۔

اور ابو بے خبر تھے......امی نے یا تو بھرم رکھنے کے لیے کبھی ان سے کچھ نہیں کہا تھا اور یا پھر اس کا رشتہ ٹوٹنے کے ڈر سے......

لیکن یہ ڈر ایک دن سامنے آ گیا جس رشتے کو وہ مضبوطی سے تھامے ہوئے تھی وہ خود اس کی گرفت سہہ نہ سکا اور ٹوٹ گیا۔

وہی روزمرہ خوف میں مبتلا کرنے والی شام کا قصہ ہے۔ کئی بار کھانا چکھنے کے باوجود بھی اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ جیسے ہی کبیر کی گاڑی گھر میں داخل ہوئی' اس کے چہرے پر تنے تاثرات نے اس کے اوسان خطا کر دیے تھے۔ یہ وہ تاثرات تھے' جو عموماً اس کی مار پیٹ کا سبب بنتے تھے۔

وہ کھانا لے کر جیسے ہی گئی' کمرے میں خلاف معمول اندھیرا تھا اور کبیر فون پر کسی سے لڑ رہا تھا۔ اس نے خاموشی سے لائٹ آن کی اور کھانا اس کے سامنے رکھا۔

جیسے ہی وہ باہر نکلی تھی' اس نے گلاس ٹوٹنے کی آواز سنی تھی۔

''کیا ہوا؟'' وہ بھاگ کر واپس کمرے میں گئی۔ کبیر کا چہرہ انتہائی سرخ تھا اور کنپٹی کی رگیں ابھری ہوئی تھیں۔

''جہنم بنا دی ہے تم نے میری زندگی۔'' وہ اٹھ کر اس کے سامنے آ کھڑا ہوا اور اس کو گلے سے پکڑ کر کہنے لگا۔ اس کی آنکھیں ابلنے لگیں۔ ''تمہاری وجہ سے میں لیٹ ہو گیا آج' تمہاری وجہ سے میں نے آج اتنی باتیں سنی۔ اتنا بڑا پروجیکٹ میرے ہاتھ سے نکل گیا۔''

''آپ نے خود ......کہا تھا کہ......دس بجے جائیں گے آپ......'' اس نے کھانستے ہوئے بمشکل اپنی بات مکمل کی۔ اس کے ہاتھ کی گرفت مضبوط تھی' یوں جیسے وہ یہ غصہ وہ بہت عرصے سے دبائے بیٹھا تھا

معاً اس نے پلوشہ کو چھوڑا اور ایک زناٹے دار تھپڑ رسید کیا' پلوشہ چکرا کر گری اور اس کا ماتھا میز سے لگا۔ خون کی ایک دھار آن کی آن میں پھوٹی۔

''بدزبان عورت۔ رحم کھا کر میں نے اس شادی پر رضامندی دی تھی کہ چچا کی اتنی بیٹیاں ہیں۔ اتنی کہ فقیر بیاہنے آئے تو فوراً بیاہ دی جائے۔ لیکن

یہ رحم تو میرے ہی گلے کا پھندہ بن گیا۔ ہر وقت میں اس رحم کی وجہ سے ذلیل ہوتا ہوں۔ کھانا پکانا اس کو نہیں آتا' بانجھ یہ ہے۔ بدزبان' بے حیا' نافرمان عورت۔" اس کا غصہ کنٹرول نہیں ہو رہا تھا اور وہ جو نیچے ماتھے پر ہاتھ رکھے ہوئے تھی' یک ٹک سر اٹھائے اس انسان کو دیکھ رہی تھی...... جس کی ایک ایک بات اس کی عزت نفس کی دھجیاں اڑا رہی تھیں۔

کبیر کے چیخنے کی آواز سن کر' سب دوڑ کر کمرے میں چلے آئے۔ تائی نے پہلی نظر میں فرش پر پڑی کھانے کی پلیٹوں کو دیکھا اور پھر پلوشہ کو ......ان کے چہرے پر نا گواری پھیل گئی یوں جیسے وہ اب تسلیم کر چکی تھیں کہ ان کا بیٹا برحق غصہ کرتا تھا۔

"ختم ہو گئی ہے میری برداشت۔ میں اب اس عورت کو برداشت نہیں کر سکتا۔ میری طرف سے فارغ ہے۔ طلاق دیتا ہوں میں اس کو۔" میز کو ٹھوکر مارتا وہ کہہ رہا تھا اب تائی کے اوسان خطا ہوئے۔ وہ فوراً آگے بڑھیں۔ کبیر کو جھنجھوڑا۔

"اللہ کا واسطہ دے رہی ہوں' آگے ایک لفظ مت کہنا۔"

تایا بھی چیخ رہے تھے۔ لیکن کبیر کا غصہ کسی طور کنٹرول نہیں ہو رہا تھا اور اس نے وہ جملہ دو دفعہ مزید دہرایا۔ تائی کے ہاتھ ڈھیلے پڑ گئے اور چہرہ سفید......

اور وہ...... پلوشہ......

اس کا ہاتھ ماتھے سے گرا' خون سے رنگا وہ اٹھی۔ اپنی سفید چادر اٹھائی۔

☆☆☆

گول فریم والے چشموں کے پار' کئی انسانوں کو پڑھا چکی آنکھیں اپنی بیٹی کو نہ پڑھ سکنے کے غم میں ہلکان تھیں۔ بے بسی کی اعلیٰ مثال بنے۔ ابو سر جھکائے پلوشہ کو کبھی دکھ سے دیکھتے...... کبھی بے بسی سے......اور کبھی ناراضی سے......

اتنے سارے احساسات کو سنبھال نہیں پا رہے تھے' اس لیے آنکھیں بے آواز آنسو چھلکا رہی تھیں۔

منظر بدلا......اور انہوں نے دیکھا کہ ان کے کمرے میں تایا بیٹھے ہیں' تائی جو مسلسل بول رہی تھیں اور کبیر...... جس کا سر جھکا تھا......

"غصے میں کہہ دیا تھا فراز! غلطی ہو گئی ہے بچے سے۔ غصے میں تو طلاق نہیں ہوتی نا' انسان کو پتا نہیں ہوتا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ کیا کر رہا ہے۔" تائی کہہ رہی تھیں اور ابو بے یقینی سے ان کے ڈھیٹ پن کو دیکھے جا رہے تھے۔

"طلاق؟ مسئلہ طلاق کا ہے؟" ابو نے بے یقینی سے پوچھا تھا۔ تائی ان کے سوال پر جز بز ہو کر رہ گئیں۔ حیرت سے ابو کو دیکھا۔ "ماتھے پر نشان دیکھو' گلے پر' ہاتھ پر' پیروں پر۔ مسئلہ طلاق کا ہے؟" اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے۔ "میں نے تو یہ سوچا تھا کہ بھائی کے ہاں بیاہ رہا ہوں ......اپنوں میں ......بیٹی سمجھتے ہیں۔ کتنی غلط فہمی کا شکار تھا میں۔" ابو کے الفاظ ٹوٹتے جا رہے تھے۔

تائی نے ان کی بات بیچ میں کاٹی۔

"واللہ۔ اللہ کی قسم کھا کر کہتی ہوں فراز۔ بیٹی سے بھی بڑھ کر سمجھا ہے۔ کیا کمی تھی اس کو پوچھیں اپنی بیٹی سے؟ ہر طرح کی آزادی دے رکھی تھی۔ اب تم جذبات میں ایسا فیصلہ مت کرو۔ ایک عدد تھپڑ مار بھی دیا تو شوہر تو مجازی خدا ہوتا ہے۔ یہ حق رکھتا ہے' تمہارا بھائی بھی تو مجھے......"

"نہیں رکھتا حق۔" ابو چلائے تھے۔ "نہیں رکھتا حق کوئی بھی' اپنی بیوی کو مارنے کا۔ میرے بھائی نے اگر آپ کو مارا بھی تو ہر بار میں آپ کے سامنے آ کھڑا ہوا' بھائی سے لڑ پڑتا آپ کے حق کے لیے۔"

"ہم مولوی صاحب سے یہ مسئلہ ڈسکس کریں گے' کوئی حل نکل آئے گا فراز۔ عزت کا معاملہ ہے۔" تایا نے پہلی بار' سنجیدگی سے اپنی تئیں بہت اہم بات کہی تھی۔ ابو استہزائیہ ہنسے تھے۔

"عزت کی ہی تو بات ہے بھائی۔ دو سالوں تک میری بیٹی اس درندے کی مار سہتی رہی۔ کتنی بار اپنی عزت نفس کے قتل پر روئی گی۔ جسمانی درد تو

کہیں دور رہ جاتا ہے عزت نفس کے کچلنے کے درد کے آگے۔ اور مسئلہ ختم ہو چکا ہے بھائی۔ طلاق دے دی ہے آپ کے درندے بیٹے نے۔ اب یہ مسئلہ بھی ختم ہو چکا اور یہ رشتہ بھی۔" ابو کا لہجہ آخر میں مضبوط ہو گیا۔

"اے زیتون! تم ہی بولو کچھ ناں۔ سات بیٹیاں ہیں۔ ابھی پہلی بیٹی کو طلاق ہو جائے تو باقی کیا بیاہو گی۔ لوگ طرح طرح کی باتیں کریں گے۔ سمجھاؤ اپنے میاں کو۔" تائی نے آخری حربہ بھی استعمال کرنا چاہا۔ زیتون بی بی، بلوشہ کے ساتھ بیٹھی بے آواز رو رہی تھیں۔ جانے اپنی بیٹی کے زخموں پر یا تائی کی باتوں پر......!

"آپ میری بیٹیوں کی فکر مت کریں۔ بلکہ کسی کو بھی فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ طلاق ہو چکی ہے، اس کے آگے کوئی بھی بحث بے کار ہے اور ایسے لوگوں کے ساتھ تو بالکل بھی نہیں...... جو میری بیٹی کے ساتھ کیے گئے ظلم میں برابر کے شریک رہے ہوں۔" ابو غصے سے سخت لہجے میں بولے تھے۔

تائی کو جب لگا کہ اب ان کا شاطر پن اور چرب زبانی ناکام ہو چکی تو چیخ کر بولیں۔

"ارے! نیکی کا تو زمانہ ہی نہ رہا۔ بجائے اس کے، کہ شکر ادا کرو ہمارا کہ دو دو بیٹیوں کا بوجھ ہلکا کر دیا الٹا کبر (تکبر) سے انکار کر—— رہے ہو۔ اس بانجھ لڑکی کو کوئی فقیر بھی نہ بیاہے، یہ تو میرے چاند سے بیٹے کا بڑا پن تھا کہ دو سال برداشت کیا ورنہ اس پھوہڑ......" تائی بے حسی کی تمام حدیں عبور کرتی کہے جا رہی تھیں اور ابو یک دم غصے سے اٹھے۔

"اس سے آگے ایک لفظ مزید کہا تو میں سارے رشتے بھول جاؤں گا۔" پوری زندگی میں پہلی بار ابو غصے سے چلائے تھے۔

تایا نے غصے سے تائی کو اٹھایا اور چلے گئے۔ ان کے جاتے ہی ابو چکرا کر کرسی پر ڈھے گئے۔ مینو فوراً سے بیشتر ان کی اور بڑھی تھی۔

"ابو......!!"

ان کی مضبوطی کو تائی کی بے حسی نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا۔

☆☆☆

ایک ہفتے تک ابو نے اس سے بات نہیں کی تھی۔ وہ ان کے پاس بیٹھتی، وہ اٹھ کر چلے جاتے۔ وہ اس سے خفا تھے بہت۔ بلکہ ابو کسی سے بھی بات نہیں کر رہے تھے۔ امی سے بھی نہیں۔ مینو کے ڈھیٹ پن کے آگے ابو کی نہیں چلتی تھی۔ اس لیے وہ صرف اس کے ہاتھ کی چائے پیتے اور کھانا کھاتے۔

وہ کھڑکی میں کھڑی باہر دیکھ رہی تھی۔ جہاں اس کے جہیز کا سامان واپس آ رہا تھا اور مینو کی منگنی کی چیزیں بھی واپس کر دی گئی تھیں۔ اتنا سامان کہ ان کے گھر کا صحن بھر چکا تھا اور انہیں اس کو سنبھالنے کی جگہ تک نہیں مل رہی تھی۔ امی سامان کو دیکھتی اور روئے جاتیں۔ اب یہ سامان کسی اور بیٹی کے جہیز میں دینے کے قابل تھا نہ ہی اس کے...... اس دن رخشندہ پھپھو آئی تھیں اور تائی کے پیچھے خوب باتیں کیں کہ سارا کیا دھرا ہی ان کا ہے ورنہ مجال تھی کبیر کی کہ وہ بلوشہ پر ہاتھ اٹھاتا۔

مینو کڑھتی۔ "منافقت کی بھی حد ہے ویسے۔"

اور یہ صرف رخشندہ پھپھو نہیں تھیں، خاندان کا ہر ایک ہمدردی کا کارڈ استعمال کرتا پہلے یہاں آ کر چائے بمع لوازمات ٹھونستا، اور کبیر کی خوب مٹی پلید کرتا۔ پھر تائی کے ہاں جا کر پیٹ پوجا کرنے کے بعد بلوشہ کے کردار پر خوب سیر حاصل گفتگو کرتا۔ اس کی طلاق کا ڈھول، سب اپنے مفاد کے لیے بجا۔

لیکن کوئی یہ نہیں دیکھ رہا تھا کہ دو خاندانوں کے بیچ ہو چکی کشیدگی کے بجائے...... اس پر کیا بیت رہی تھی؟ جو مظلوم تھی؟...... یعنی بلوشہ فراز......

وہ تو اندر سے کب کی ٹوٹ چکی تھی۔ ایک زندہ لاش تھی، جس کی عزت نفس کا کفن کب سے تار تار ہو چکا تھا۔ اس کی خاموشی امی کو رلاتی مینو اس سے

باتیں کرنے کی کوشش کرتی، لیکن وہ خاموش ہی رہتی ۔شام کے پر پھیلتے ہی' اس کی آنکھیں خوف اور ہراس کی سیاہی سے پر ہو جاتیں ......وہ ایک جگہ بیٹھی تھر تھر کانپتی ۔مینو اس کو گلے لگا کر روہانسی ہو کر کہتی۔

''کوئی نہیں ہے پلوشہ! کوئی بھی نہیں ہے۔''

پلوشہ مینو کا لمس پا کر' گہری گہری سانسیں لیتی۔ایک آنسو بے آواز اس کے گالوں پر بہتا۔اس دوران اس کی عدت بھی ختم ہو چکی تھی اس کے لیے رخشندہ پھپھو کی طرف سے ان کے بیٹے کا رشتہ آ گیا......جس کو ابو نے بہت نرمی سے مسترد کر دیا۔ابو اب اپنے خاندان میں اپنی کسی بھی بیٹی کا رشتہ نہیں کرنا چاہ رہے تھے اور اس صورت میں تو قطعاً نہیں ......جب لڑکے کے مزاج و کردار کا پورے خاندان میں چرچا ہو......!!

☆☆☆

''مینو! مینو!''

دوپہر کی دھوپ منڈیروں پر چڑھ آئی تھی اور ابو نماز پڑھ کر گھر میں داخل ہو کر مینو کو آواز دے رہے تھے حالانکہ انہیں پتا تھا کہ مینو یونی ورسٹی میں ہوتی تھی اس وقت۔

وہ لیپ ٹاپ کھولے' پی ایچ ڈی کے لیے یونی ورسٹی کا انتخاب کر رہی تھی۔اس کا ارادہ باہر جانے کا نہیں تھا......بس وہ پڑھائی میں خود کو مصروف رکھنا چاہ رہی تھی اگرچہ وہ مختلف ہسپتالوں میں' پرائیٹ لیپس میں جاب کے لیے مسلسل اپلائی بھی کر رہی تھی۔

''جی ابو!'' وہ سر پر دوپٹہ ٹھیک کرتے باہر نکلی تو ابو ہاتھ میں پھلوں کا شاپر پکڑے کھڑے تھے۔باقی بہنیں اسکول کے بعد' پاس فوزیہ باجی سے قرآن پڑھنے گئی ہوئی تھیں۔

ابو نے بنا کچھ کہے' اس کو شاپر پکڑائے اور اپنے کمرے چلے گئے۔

''ابو کھانا کھائیں گے آپ؟'' پلوشہ نے پوچھا ۔ابو رکے' لیکن پیچھے مڑے نہیں......

''نہیں......میں کھا چکا ہوں اسکول میں۔''

''چائے؟ قہوہ؟''

اتنا سن کر ابو اپنے کمرے چلے گئے۔وہ کچھ دیر وہیں کھڑی رہی۔ابو کی خفگی بدستور جاری تھی۔وہ اس سے اس لیے خفا تھے کہ اس نے جانتے بوجھتے ظلم سہا تھا۔

وہ پھل فریج میں رکھ کر' چائے بنانے لگی۔ابو کی یہ عادت تھی قیلولہ ۔ سے پہلے چائے پیتے تھے۔ مینو کی جب چھٹی ہوتی تو وہ کھانے کے فوراً بعد چائے چڑھا دیتی تھی۔جب سے مینو نے کھانا پکانا سیکھا تھا۔کچن کا شعبہ وہی سنبھالتی تھی۔

چائے کے دو کپ بھر کر اور اس کے ساتھ خشک میوہ جات رکھ کر' وہ ابو کے کمرے میں گئی تو ابو حسب معمول صبح کا اخبار پڑھ رہے تھے۔

''ابو چائے!'' چائے سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر وہ بھی وہیں بیٹھ گئی۔کچھ دیر تک ان میں خاموشی رہی۔ بالآخر جب ابو نے چائے کا کپ اٹھایا تو اس نے پوچھ ڈالا۔

''ابو! آپ ابھی تک خفا ہیں؟''

''نہیں۔''

''تو آپ مجھ سے بات کیوں نہیں کرتے۔''

''کیا بات کرنی ہے؟''

''کچھ بھی......مطلب میں نے آپ کو پرسوں کہا تھا کہ مجھے پی ایچ ڈی کرنی ہے' آپ نے صرف ہمم کہا۔میں نے پوچھا کہ میں جاب کر لوں؟ آپ نے کر لو' کہا۔پلیز ابو! مجھ سے کوئی غلطی ہوئی ہو تو مجھے معاف کر دیں......میں تو بس اس لیے خاموش تھی کہ......'' وہ باقاعدہ رونے لگی۔ابو نے چائے کا کپ میز پر رکھا اور اخبار تہ کر کے پہلی بار اس کی آنکھوں میں دیکھا تھا۔

''کہ وہ تمہیں طلاق دے دے گا اور پھر تمہاری بہنوں کے لیے مشکلات کھڑی ہو جائیں گی؟ کیونکہ تمہاری بہنوں کو تو یہ معاشرہ پال رہا ہے ناں

میں نہیں...... معاشرے کو زیادہ فکر ہے‘ مجھے نہیں تمہیں پتا ہے‘ پلوشہ! تمہاری غلطی کیا ہے؟ یا میں کیوں خفا ہوں تم سے؟ اس لیے...... کیونکہ میں نے تمہیں اتنا پڑھایا‘ لکھایا پھر بھی تم اپنے اوپر ہوتے ظلم پر خاموش رہیں؟ یہ ایک تعلیم یافتہ انسان کرے گا؟"

"میں تو بس...... اس لیے......" اس کی ہچکی بندھ گئی۔

"تم اپنی بہنوں کے ساتھ اچھا نہیں کر رہی تھیں۔ تم الٹا یہ ظلم سہ کر ان کے ساتھ برا کر رہی تھیں۔ ظلم کسی بھی صورت میں ہو‘ اس کو کنڈیم کرنا چاہیے۔ جب ایک ایم فل کی اسٹوڈنٹ‘ ڈومیسٹک ابیوز پر خاموش رہے۔ وہ ایک ان ایجوکیٹڈ لڑکی کو کیا ترغیب دے گی؟ کہ وہ بھی اس کی طرح اپنے لب سی لیں؟

تم نے مجھے بہت مایوس کیا ہے‘ پلوشہ! میری زندگی کی ساری محنت اور اپنی ساری تعلیم ضائع کردی۔" ابو کے لہجے میں واقعی اس کے لیے مایوسی تھی۔

"آئی ایم سوری ابو!" وہ اٹھ کر ان کے گلے لگ گئی۔ "یہ میری غلط فہمی تھی کہ میں ٹھیک کر رہی ہوں...... پلیز مجھے معاف کر دیں!"

ابو نے اس کے ماتھے پر بوسہ دیا اور مسکرائے۔ "کس یونی ورسٹی سے پی ایچ ڈی کرنی ہے؟"

☆☆☆

صبح وہ اٹھا‘ تو حیدر سو رہا تھا خلاف معمول۔ ورنہ اس کی آنکھ سورج طلوع ہوتے ہی کھل جاتی تھی۔ پھر شام کو کہیں دو تین گھنٹوں کے لیے سو جاتا تھا۔ باہر نکلا تو امی کچن میں کھڑی‘ دادی کا ناشتہ تیار کر رہی تھیں۔ امی صرف دادی اور اپنا ناشتہ بناتی تھیں۔ باقی تینوں بھابھیوں نے اپنا کام تقسیم کر رکھا تھا۔

وہ کچن میں آیا تو امی کو سلام کر کے‘ پانی میں فیڈر ڈال کر ابالنے لگا۔

"رہنے دو میں بنا دوں گی۔" امی نے ہمیشہ کی طرح اس کو منع کیا۔

اور اس نے وہی پرانا جواب۔ "خیر ہے امی۔ میں کر لوں گا۔"

وہ تقریباً حیدر کے سارے کام خود کرتا تھا۔ اس کو کھانا کھلانا‘ ڈائپر بدلنا‘ فیڈر بنانا۔ کپڑے بھابھیاں دھو دیتی تھیں۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کا بیٹا اس گلٹ میں بڑا ہو‘ کہ اس کی ماں نہیں تھی اور باپ نے اس کو دوسروں کے سہارے چھوڑ دیا تھا۔ اکثر امی وغیرہ اس پر خفا بھی ہو جایا کرتے۔

"ہم پرائے تھوڑی ہیں۔ لوگ کیا کہتے ہوں گے کہ مجتبیٰ کو اپنے خاندان والوں پر بھروسہ نہیں یا اس کے اپنے اس کے بیٹے کے ساتھ سوتیلا سلوک کرتے ہیں؟"

وہ گہری سانس لے کر‘ چہرے پر ایک تھکی مسکراہٹ سجا کر جواب دیتا‘ اگرچہ وہ دلیل نہ ہوتی کہ وہ قائل ہو جاتے۔

"امی‘ اتنے بڑے کام نہیں ہیں کہ میں نہ کر سکوں۔ جو کام میں نہیں کر سکتا‘ وہ آپ کو کہوں گا۔"

امی خاموش ہو جاتیں۔

اس نے پی ایچ ڈی کے لیے پشاور یونی ورسٹی میں اپلائی کیا تھا۔ ٹیسٹ کے بعد اس نے انٹرویو بھی کلیئر کر لیا تھا اور اب اس کی زندگی تھوڑی بہت معمول پر آ گئی تھی۔

ابھی بھی حیدر کے فیڈر کے بعد اس نے ناشتہ کیا اور جانے سے پہلے امی کو یاد دہانی بھی کروائی کہ حیدر کے اٹھتے ہی اس کو فیڈر پلا دیجیے گا۔

"میں نو بجے تک آؤں گا‘ ان شاء اللہ۔"

گاڑی میں بیٹھتے ہی‘ اس کو اپنے سپروائزر سر اقرار کا واٹس ایپ پر میسج آیا۔ اس نے ٹائم دیکھا تو آٹھ چالیس بج رہے تھے۔ اس کا رنگ اڑا۔ فوراً ایکسیلٹر پر ہاتھ رکھا اور تب تک نہ اٹھایا‘ جب وہ ڈیپارٹمنٹ نہ پہنچا۔

وہ والس ایپ کھولے تیزی سے سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔ معاً وہ کسی سے ٹکرایا اور شیشے کے ٹوٹنے کی آواز آئی۔ شرمندہ ہو کر اس نے سامنے دیکھا تو لڑکی کا چہرہ انتہائی سرخ ہو چکا تھا۔

"آئی ایم سوری۔" وہ نیچے جھک کر پیٹری پلیٹس اٹھانے لگا کہ لڑکی نے ٹوکا۔

"رکیں۔ میں کر لوں گی۔" وہ نیچے جھکی اور پیٹری پلیٹس کی ٹوٹی کرچیاں سمیٹنے لگی۔

وہ بھی شرمندہ ہو کر کرچیاں سمیٹنے لگا تھا۔ لڑکی نے اب کی بار اس کو دیکھا۔

"میں نے آپ کو کہا ناں، کہ۔ میں کر لوں گی۔ آپ نے گلوز نہیں پہنے ہوئے۔" اس لڑکی نے اپنے ہاتھ میں پہنے ہوئے دستانوں کی اور نظروں سے اشارہ کیا۔ "اور یہ فنجائی کی پیٹری پلیٹس ہیں۔"

"اوہ! سوری!" ایک دفعہ پھر وہ شرمندگی سے پانی پانی ہو گیا۔

"آپ کو اگر اور پلیٹس چاہئیں تو......" مجتبیٰ نے جھجک کر پوچھا۔

"نہیں۔ تھینک یو۔"

"اگر آپ کو......" اس نے مزید اصرار کرنا چاہا تھا۔

"میں اجنبیوں کی ہیلپ نہیں لیتی، شکریہ۔"

اس لڑکی کا لہجہ مضبوط تھا اور وہ کرچیاں سمیٹ کر مڑی اور نیچے اترنے لگی۔

وہ کچھ دیر رکا، اس کے کان تک سرخ ہو چکے تھے۔ صبح کی شروعات بہت بری ہوئی تھی۔

اس لڑکی کی آنکھیں کتنی اداس تھیں......اس آنکھوں کی طرح، اداس کہانی کہتی آنکھیں......اور اس کی آواز نرم ہونے کے باوجود بھی کتنی مضبوط تھی۔

اس نے سر جھٹکا، پورے انٹرویو میں اس کے ذہن پر اس کا چہرہ جانے کیوں چھا رہا تھا۔ وہ حیرت سے خود سے پوچھ رہا تھا۔

☆☆☆

اس نے پشاور یونی ورسٹی سے پی ایچ ڈی کا ارادہ کیا اور باقی کا سفر آسانی سے طے ہوا۔ ٹیسٹ، انٹرویو، ہاسٹل وغیرہ۔ وہ بہت خوش تھی، لیکن اس کی ساری خوشی کرکری ہو گئی......جب اس نے اپنے سپروائزر کی سپرویژن میں کام شروع کیا۔ وہ انتہائی کھڑوس اور سخت مزاج تھے۔ ماتھے پر ہمہ وقت رہنے والی پانچ شکنیں۔ جس کو وہ ہر میٹنگ میں گنتی تھی۔ یہ اس کی غلط فہمی تھی کہ اس کی پی ایچ ڈی جلدی ہو جائے گی اور پشاور میں بہت یادگار وقت گزرے گا۔

اس دن وہ انکیوبیٹر سے پلیٹس نکال کر نیچے اپنے آفس جا رہی تھی کہ ایک لڑکا اس سے ٹکرایا اور اس کے دس دنوں کی ساری محنت زمین بوس کر دی تھی۔ اگرچہ وہ بہت شرمندہ ہوا لیکن اس نے اپنے غصے کو قابو کیے رکھا۔ وہ دن اس کا خراب دن تھا۔

اگلے دن جب وہ اپنے آفس جانے لگی تو ایل ایف ایچ (مائیکروبائیولوجی میں مائیکروبس کو گرو کرنے کا ایک apparatus) میں ایک لڑکا بیٹھا کام کر رہا تھا۔ اس کی پشت پلوشہ کی طرف تھی۔

آفس میں کسی کی موجودگی محسوس کرتے ہوئے، وہ لڑکا مڑا اور پلوشہ کو دیکھ پہلے سلام کیا اور پھر گویا ہوا۔

"مس پلوشہ فراز! آپ کو سر خبیر نے آفس بلایا ہے۔ انہوں نے میسج چھوڑا تھا۔"

وہ جو اس کی موجودگی پر حیران و پریشان تھی، اس کے طوطے اڑ گئے۔ انہوں نے رپورٹ مانگی تھی اور کل تو اس لڑکے کی وجہ سے اس کا سارا کام تباہ ہو گیا تھا۔ اس کے گال مزید سرخ ہونے لگے۔

مجتبیٰ نے پہلے حیرت سے دیکھا اور پھر اس ڈر سے کہ پھر سے اس کو شرمندہ نہ کر دے۔

"ایوری تھنگ آل رائٹ؟"

"یس۔ یس۔" ناخن دانتوں سے کترتے ہوئے، اس نے کہا۔ اس کے لہجے میں سراسیمگی واضح طور پر تھی۔ اتنا کہہ کر وہ فوراً مڑی اور باہر چلی گئی۔

جب آئی تو اس کا چہرہ مزید سرخ تھا۔ وہ جو

لیپ ٹاپ پر ریسرچ آرٹیکلز کھنگال رہا تھا۔ حیران ہو کر دیکھ رہا تھا۔ مجتبیٰ کا دل چاہا کہ ایک دفعہ پھر پوچھ لے کہ وہ ٹھیک ہے۔ لیکن اس نے خاموش ہونا مناسب سمجھا۔

وہ خاموشی سے اپنا کام کرنے لگی۔ دونوں کے درمیان خاموشی چھائی رہی۔

☆☆☆

''میں اجنبیوں کی ہیلپ نہیں لیتی' شکریہ۔''

آسمان تاروں سے بھرا تھا اور ان تاروں میں کہیں اس کی نظر ایک چہرہ ڈھونڈ رہی تھی۔۔۔ وہ کوئی کہانی کہتی اداس آنکھیں' نرم لہجہ اور کان کے پیچھے اڑسی وہ لٹ۔

اس نے معاً سر جھٹکا اور کھڑکی سے نظریں ہٹا لیں۔ کیا وہ پلوشہ فراز کے بارے میں زیادہ سوچنے لگا تھا؟...... یقیناً۔

اس نے پلٹ کر دیکھا۔

حیدر اس کے قریب ہی سو رہا تھا' اس کا ٹیب الٹا پڑا تھا اور اس پر کوئی کارٹون چل رہا تھا۔ اس نے آرام سے حیدر کے ہاتھوں میں پھنسا ٹیب اٹھایا اور سائیڈ ٹیبل پر رکھا۔ پھر فیڈر چیک کیا' وہ بھی تقریباً ختم تھا۔ اس کو دادی کب سے منع کر رہی تھیں' اب تین سال کا ہو چکا ہے۔ اس کو کھانا کھلانے کا عادی بناؤ۔ لیکن حیدر کے نخرے تھے۔ اس کو آلو نہیں پسند تھا نہ سیب' آم۔ بس کیلا کھا لیا کرتا تھا۔ اب جب اس کا زیادہ وقت باہر گزرنے لگا تو امی دوپہر میں اس کو کھانا کھلا دیا کرتی تھیں۔ اور اس کو یہ ماننا پڑ رہا تھا کہ اس کی حیدر کی کیئر کرنا' امی کے تجربے کے سامنے کچھ نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی' کہ صبح کا فیڈر ناشتے میں بدلا اور فیڈر محض رات کے لیے رہ گیا۔

اگلی صبح بہت روشن تھی۔ نومبر کی صبح' اوس سے بھیگ چکی تھی اور سورج کی نارنجی روشنیاں اوس سے گیلی سڑکوں پڑتیں تو یوں معلوم ہوتا کہ جیسے کسی نے سڑک پر موتی بکھیر دیئے ہو۔

اس نے کوبام (سنٹر آف بائیوٹیک اینڈ مائیکرو بائیوڈیپارٹمنٹ) کے پارکنگ لاٹ میں گاڑی پارک کی جیسے ہی ڈیپارٹمنٹ جانے لگا تو اس کو فٹ پاتھ پر کھڑی پلوشہ نظر آئی۔ سیاہ شلوار قمیص پہنے' اس کا حسن مزید نکھر رہا تھا۔ وہ بھی ڈیپارٹمنٹ کی طرف آ رہی تھی' اس نے دو بار مڑ کے دیکھا تھا۔ معاً اس کے سامنے گاڑی رکی اور اس کے چہرے پر غصہ اور خوف بیک وقت نظر آیا۔ وہ گاڑی اس کا دور سے پیچھا کر رہی تھی...... اس کے قدم فوراً اس کی جانب بڑھے تھے۔

☆☆☆

''ایکسیوزمی؟''

پلوشہ کا خون ابلنے لگا۔ اس لڑکے کی جرات اور بے شرمی پر اس کا پارہ چڑھنے لگا۔ لیکن اس نے خود کو پرسکون کیا اور بہت تحمل سے پوچھا کیا۔

وہ کسی امیر شخص کا بگڑا بیٹا تھا' جس کو اپنے پیسوں کا زعم تھا۔ گلاسز چڑھائے' جیل سے سیٹ کیے گئے بال' مہنگی گھڑی اور لیدر جیکٹ۔ وہ سنٹرل لائبریری سے اس کو فالو کر رہا تھا۔ پہلے تو اس نے اگنور کر دیا' لیکن اب وہ اس کے ڈیپارٹمنٹ تک پہنچ گیا۔ اور وہ اتنی بے شرمی سے اپنی بات دہرا رہا تھا۔

''دراصل آپ سے ضروری بات کرنا تھی' تو اگر آپ کمفرٹیبل نہیں ہیں تو آپ مجھے اپنا نمبر دے دیں یا میرا لے لیں۔ پلیز اٹس ارجنٹ!''

''میں کمفرٹیبل ہوں' بھائی!'' اس نے پھر تحمل سے بات کی۔

''آپ نیچے اتر کر مجھے بتائیں' آپ کو کیا ارجنٹ بات کرنی ہے۔''

اس کے اردگرد لوگ گزرتے پیچھے مڑ کر دیکھتے جا رہے تھے۔ وہ لڑکا جز بز ہو گیا۔ اس سے پہلے کہ پلوشہ اس کو کھری کھری سناتی' ایسے میں مجتبیٰ آیا اور پلوشہ سے کہنے لگا۔

''آپ جائیے۔ میں دیکھتا ہوں۔''

پلوشہ نے پہلے اس کو حیرت سے دیکھا۔ وہ کچھ کہنے ہی والی تھی کہ وہ آگے بڑھا اور اس لڑکے سے

مصافحہ کیا۔ اب وہ اس کو اترنے کا کہہ رہا تھا۔ مجتبیٰ نے مڑ کر اس کو دیکھا اور پہلی بار اس کی نظروں میں حکم تھا...... ایک حفاظت کرنے والے کا حکم......

پلوشہ مڑی اور تیزی سے ڈیپارٹمنٹ جانے لگی۔

"کیا نام ہے آپ کا؟"

"مبشر ناصر خانزادہ۔" لڑکے نے اپنے سرنیم کا رعب جمانا چاہا۔

مجتبیٰ مسکرایا۔ "تو ناصر خانزادہ کے صاحبزادے ہیں؟ جو اس بار الیکشن لڑنے والے ہیں؟" مجتبیٰ استہزائیہ ہنس کر سر ہلانے لگا۔

"اچھا بیٹے۔ اب میری بات غور سے سنو۔ آپ کے والد ایک نامی گرامی شخصیت ہیں اور سیاست دانوں کے کیریئر کے لیے کنٹروورسیز بہت بری ثابت ہوتی ہے اور پھر ہمارے پختون معاشرے میں...... یہ سوشل میڈیا پر وائرل ہو گیا کہ ان کا بیٹا پشاور کی یونیورسٹی میں ایک لڑکی کو ہراس کر رہا ہے...... پھر جن چیزوں پر آپ اترا رہے ہیں ناں۔ یہ تو جائیں گی ہی...... ساتھ میں آپ کے باپ کی ریپوٹیشن بھی۔"

مبشر نامی لڑکا طنزیہ ہنسا۔

"آپ اتنا کیوں بول رہے ہیں؟ بہن ہے آپ کی؟"

اب کی بار مجتبیٰ آگے بڑھا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر زور سے دبایا۔ "اپنی بہن سے...... دور رہو...... ورنہ......!"

مبشر کا ہاتھ اس کی سخت گرفت سے سرخ پڑنے لگا۔ اس نے مجتبیٰ کی آواز میں غراہٹ اور آنکھوں میں تپش دیکھی اور اگلے پل اس کا چہرہ متغیر ہوا۔ اس نے ہاتھ چھڑایا اور فوراً بھاگ کھڑا ہوا

۔

مجتبیٰ نے ہاتھ جھاڑا' یہ بگڑے امیرزادے محض زبان کے تیز ہوتے ہیں ورنہ تو چھوٹی موٹی ڈرپوک......!

☆☆☆

آفس جا کر لیپ ٹاپ کھولا' کل کی رپورٹ پڑھنے لگی۔ لیکن الفاظ اس کی نظروں کے سامنے سے گزرتے جا رہے تھے۔ اس انسان کے ساتھ مسلسل ٹکراؤ اس کو مردوں کا وہ کون سا روپ دکھا رہا تھا؟ ۔ کیا وہ سب مردوں کو کیبز کے پیمانے پر ماپنے لگی تھی ؟...... یقیناً...... سب مرد ایک جیسے ہوتے ہیں۔ حکم جتاتے ہیں' ظلم کرتے ہیں اور عورتوں کو مظلوم سمجھ کر اپنی انا کو تسکین پہنچاتے ہیں۔ وہ سوچ جا رہی تھی۔ احتساب کر رہی تھی۔ لیکن ابھی بھی اس کا ترازو اچھے اور برے میں سے برے کی طرف زیادہ جھک رہا تھا۔

ایسے میں' مجتبیٰ داخل ہوا اور سلام کر کے پی سی آر کی اور بڑھ گیا۔ وہ اس کی پشت کو گھورتی رہی۔ معاً اٹھی۔

"میں نے آپ کو منع کیا تھا۔ آپ بلاوجہ میری ہیلپ کرنے کی کوشش مت کیجیے۔ کسی فلاحی ادارے میں بھرتی ہیں کیا آپ؟"

مجتبیٰ مڑا۔

"وہ مدد نہیں تھی۔" مضبوط لہجے میں کہا۔ "وہ میری پختو (غیرت) کو گوارا نہیں تھا کہ کسی لڑکی کو یوں کوئی بیچ راستے میں ہراس کرے۔ آپ کی جگہ کوئی بھی لڑکی ہوتی تو میں یہی کرتا۔ یہ میں نے غیرت کے لیے کیا۔ اپنی غیرت کے لیے۔"

اب وہ استہزائیہ ہنسی۔

"بات وہی پھر غیرت کی آ ہی گئی۔ آپ میرے مسئلوں سے اپنی غیرت کو دور رکھیں' مسٹر مجتبیٰ خلیل۔ مجھے اپنے مسئلے خود حل کرنے دیجیے۔ مجھے آپ مردوں کے ٹیکٹکس کے بارے میں خوب معلوم ہے۔ میں کوئی امیچور لڑکی نہیں ہوں۔" وہ پہلی بار غصے سے بولی۔ بولتے بولتے اس کا تنفس چڑھ گیا۔ مجتبیٰ خاموشی سے سنتا رہا۔

"ویل' آپ کی مردوں کے بارے میں رائے کافی منفی ہے۔" اتنا کہہ وہ اپنی چیزیں سمیٹ کر'

چلا گیا۔ اس نے یہ نہیں کہا وہ اس کی مدد نہیں کرے گا' آئندہ۔

اس نے گہری سانس خارج کی اور واپس ریسرچ آرٹیکل پڑھنے بیٹھ گئی۔ الفاظ ہنوز اڑتے جا رہے تھے۔ لنچ کے دوران اس کو وہ لڑکا پھر سے نظر آ گیا لیکن اب کی بار اس نے پلوشہ کو یکسر نظر انداز کر دیا اور فوراً وہاں سے ہٹ گیا۔ پلوشہ تحیر سے اس کو دیکھتی رہ گئی۔ مجتبیٰ نے آخر اس کو ایسا کیا کہہ دیا تھا۔

☆☆☆

پلوشہ نے کچھ دنوں تک اس کو نظر انداز کیا اور مجتبیٰ نے بھی اس سے حتی المقدور بات نہیں کی۔ پلوشہ ہاسٹل آ کر اس کے بارے میں سوچتی رہتی اور پھر خود پر غصہ ہوتی کہ وہ اس انسان کے بارے میں کیوں سوچے جا رہی تھی۔

وہ خود ہی نہیں طے کر پا رہی تھی۔

اس دن بہت دنوں بعد سورج نکلا تھا۔ دسمبر کا سورج غنیمت کی طرح تھا۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے پوری یونی ورسٹی کلاسز بنک کر کے لان میں دھوپ سینک رہی تھی۔ وہ آفس لیٹ پہنچی۔ وہاں ایک بچہ بیٹھا ٹیب پر کارٹون دیکھتے ہوئے' ہاتھ میں چاکلیٹ پکڑے تھا۔

اس کا دل زور سے دھڑکا اور اس کو پھپھو کی بات یاد آئی اور اولاد کے لیے کیا گیا دو سالوں تک مسلسل علاج یاد آیا......! وہ کسی ٹرانس کے عالم میں آگے بڑھی اور بچے کو دیکھتے ہی اس کا دل ایک دم سے کئی احساسات سے بھر گیا۔

''ہیلو۔'' اس نے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر' مسکرا اس بچے سے کہا۔ بچے نے ٹیب سے سر اٹھا کر دیکھا اور مسکرایا لیکن جواب میں کچھ نہیں کہا۔

''کیا نام ہے بے بی آپ کا؟'' وہ پوچھ رہی تھی' وہ اس کی کرسی کے پاس بیٹھ کر پوچھنے لگی۔

''حیڈر!'' بچے نے کہا اور وہ اس کے 'ڈ' کو 'ڈ' کہنے پر ہنس پڑی......

''ہاؤ کیوٹ! کس کے ساتھ آئے ہو؟''

''بابا......'' وہ ٹیب سے سر اٹھائے بنا کہہ رہا تھا۔

''اور بابا کہاں ہیں؟'' اب وہ حیرت سے پوچھ رہی تھی۔ اس کے ساتھ تو تین لڑکیاں اور محض مجتبیٰ کام کرتا۔ معاً شائلہ داخل ہوئی۔

''مجتبیٰ کا بیٹا ہے......اس کی میٹنگ ہے سر کے ساتھ تو مجھے اس کا خیال رکھنے کا کہا ہے اور اب بدقسمتی سے مجھے بھی میم حرا نے بلالیا ہے آفس۔ پلیز تم اس کا خیال رکھنا تب تک...... جب تک مجتبیٰ نہ آ جائے......پلیز!''

وہ جوگنگ بیٹھی سنے جا رہی تھی کہ یہ مجتبیٰ کا بیٹا ہے......اس کو یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔ مطلب اس کی شادی ہو چکی تھی۔

''تم سے کہہ رہی ہوں' پلوشہ!'' شائلہ نے اس کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ ہلا کر کہا۔

''اوکے......اوکے......تم جاؤ میں خیال رکھ لوں گی۔'' اس نے ہامی بھر لی۔

شائلہ شکریہ ادا کر کے چلی گئی اور اب وہ اس کے ساتھ بیٹھ کر' اپنے بیگ پیک سے چپس نکال کر پیش کرنے لگی۔ اس نے سر نفی میں ہلایا۔

''بابا نے کہا تھا......اسٹرینجر سے کچھ نہیں لیتے۔'' حیدر نے اپنے معصومانہ لہجے میں ٹوٹے پھوٹے الفاظ کے ساتھ یہ جملہ مکمل کیا۔ پلوشہ نے ابرو اٹھا کر' او آئی سی والے انداز میں اس کو دیکھا۔

(یعنی مسٹر مجتبیٰ! بہت کیئرنگ بابا ہیں۔ نائس)

حیدر نے اکتا کر ٹیب بند کی اور کرسی سے اترنے لگا۔ پلوشہ نے فوراً اس کو واپس بٹھایا۔

''مجھے بابا کے پاس جانا ہے۔''

''بابا آنے والے ہیں' حیدر! تب تک میں آپ کو ایک کہانی سناؤں؟'' اس نے اس کو روکنا چاہا۔

حیدر نے حیرت سے بھرے انداز میں اپنی بڑی بڑی نیلی آنکھیں کھول کر دیکھا۔ ''پچ (سچ؟)؟''

وہ اس کے انداز پر پھر سے ہنس پڑی۔

"سچ۔ اچھا۔ سنو بہت پہلے ایک......"

حیدر انتہائی دلجمعی سے کہانی سن رہا تھا اور آخر میں جیسے ہی کہانی ختم ہوئی۔ وہ اپنی کرسی پر کھڑا ہوا اور تالیاں پیٹنے لگا۔ پلوشہ نے مسکراتے ہوئے جلدی سے اس کو گلے لگایا تاکہ گر نہ جائے۔

"اچھا' حیدر! میرے دوست بنو گے؟" پلوشہ ہاتھ بڑھا کر پوچھ رہی تھی۔ حیدر نے فوراً اس کو اپنا ہاتھ دیا اور مسکرا کر کہا۔

NOVELS LAND 📚📚

"لیش! (یس)"

"چلو پھر ایس ٹی سی چلتے ہیں۔ آپ کو کیا پسند ہے؟ چاکلیٹ' کوکومو' چپس؟"

"کوکومو......کوکومو......" حیدر پرجوش لہجے میں بولا۔ پلوشہ نے اس کا ہاتھ پکڑا اور ایس ٹی سی (کیفے ٹیریا) تک اس سے باتیں کرتی رہی۔ وہ اس کے معصومانہ لہجے پر مسکرائے جاتی۔ جانے کیوں' دل کے کسی خانے میں وہ اس ابھرتے جذبے کو کوئی نام نہیں دے پا رہی تھی......کیا وہ ممتا کی محرومی تھی' جو اس نے پورے دو سال تک محسوس کی تھی یا پھر وہ خواہش تھی؟......

وہ حیدر کے ساتھ لگی باتیں کرتی رہی اور اس کو پورے لان کی سیر کروا کر جب وہ آفس میں آئی تو مجتبیٰ ابھی تک نہیں آیا تھا۔ اس نے حیدر کو کرسی پر بٹھایا اور باہر آفس کے عین سامنے فلٹر سے بوتل بھرنے لگی۔ جب وہ آفس میں داخل ہوئی تو اس کی اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔

حیدر وہاں نہیں تھا۔ وہ فوراً باہر نکلی۔ اس کا چہرہ متغیر ہونے لگا۔ تنفس چڑھنے لگا۔ اس کو تین سال کے بچے کو یوں دو منٹ کے لیے ہی' لیکن اکیلا نہیں چھوڑنا چاہیے تھا۔ وہ اس کے باپ کو کیا جواب دے گی؟۔

"اللہ......اللہ......" اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھرنے لگیں اور وہ آس پاس دیکھنے لگی۔ وہ کہیں نہیں تھا۔ وہ اس انسان کو کیا جواب دے گی' جس کو اس نے ہر ملاقات میں شرمندہ کیا ہے......' اس کا دل گھبرانے لگا......عین اسی وقت' مجتبیٰ سیڑھیاں اترتا دکھائی دیا اور اس کو مزید رونا آیا۔

"مس فراز؟ کیا ہوا؟ سب خیریت؟" مجتبیٰ اس سے پوچھ رہا تھا۔

"آئی ایم سوری۔ سو سوری۔ شمائلہ نے مجھے حیدر کے پاس بیٹھنے کا کہا اور میں پورے دو گھنٹے اس کے ساتھ بیٹھی رہی اور......" اس کی ہچکی بندھ گئی۔

"اور پھر میں آفس کے سامنے فلٹر سے پانی بھرنے گئی دو منٹ کے لیے۔ اور......جب میں واپس آئی تو......حیدر آفس میں نہیں تھا......وہ کہاں گیا......آئی ایم سوری......پلیز......"

وہ رو رہی تھی اور مجتبیٰ فوراً آفس کی اور بھاگا تھا وہ بھی اس کے پیچھے بھاگنے لگی۔

"حیدر؟ بیٹا......" وہ ایسے پکار رہا تھا جیسے حیدر وہیں کہیں تھا۔ اب وہ ٹیبل کے نیچے جھک کر دیکھ رہا تھا اور حیدر وہیں بیٹھا تھا۔ مجتبیٰ نے فوراً اس کو نکالا اور ماتھا چوما۔

پلوشہ نے جیسے ہی حیدر کو سامنے دیکھا۔ یک دم وہ مڑی اور دوبارہ رونے لگی۔

"دراصل اس کو جب میری بہت یاد آتی ہے یا مجھ سے خفا ہوتا ہے' تو یہ سب سے چھپ کر اپنے کمرے میں کھلونے والے گھر میں چھپ کر بیٹھ جاتا ہے۔" وہ پلوشہ کو مسکرا کر کہہ رہا تھا۔ اس کی ناک ٹماٹر بن رہی تھی۔

"لک' حیدر! آپ نے مس پلوشہ کو اتنا پریشان کر دیا......سوری کہو......" وہ پیار سے کہہ رہا تھا۔

"سوری فرینڈ۔" اس نے اپنی معصوم آواز میں کہا۔ پلوشہ روتے ہوئے ہنس پڑی۔

☆☆☆

شام کو مجتبیٰ جب ہوٹل سے لوٹا تو حیدر جاگ چکا تھا اور دادی کی گود میں بیٹھا' ان کو اپنی ٹوٹی پھوٹی زبان میں قصے سنا رہا تھا۔ دادی اس کی توتلی زبان پر

ہاری صدقے ہوتے ہوئے جا رہی تھیں۔ وہ دادی کو سلام کرتا ان کے پاس ہی بیٹھ گیا۔

"اور یہ چاکلیٹس کس نے دیے' میرے سلطان حیدر کو؟" دادی اس کے ہاتھ میں موجود پاکٹ کے بارے میں پوچھ رہی تھیں۔

"یہ میری فرینڈ نے۔"

"اور آپ کی فرینڈ کون ہے؟"

مجتبیٰ نے پہلو بدلا' اس کے بعد سوالنامہ اس کی طرف مڑتا تھا۔

"میری فرینڈ!" حیدر نے اپنی معصوم لہجے میں' کندھے اچکا کر جواب دیا۔ وہ دونوں ہنس پڑے۔

"اور آپ کی فرینڈ کا نام کیا ہے؟"

حیدر نے کندھے اچکائے' اس نے یہ حرکت سیکھی تھی اور ہر جواب میں یہ ری ایکشن دیا کرتا تھا۔

دادی کے لیے حیدر کا کسی انجان لڑکی کے ساتھ لگاؤ' خوشی کا باعث بن رہا تھا۔ وہ اب انجان بن چکے مجتبیٰ کی طرف مڑیں۔

"مجتبیٰ! حیدر نے آج کس کے ساتھ اتنا وقت گزارا تھا کہ اس کی زبان سے اس کا نام ہی نہیں جا رہا؟"

مجتبیٰ آہستگی سے کہا۔ "میرے ساتھ پی ایچ ڈی کر رہی ہے۔"

اسی وقت امی بھی داخل ہوئیں۔ دادی جوش سے آگے آئیں۔

"شادی شدہ ہے یا کنواری؟"

"دادی!" اس نے دادی کو ناگواری سے دیکھا تھا۔

"کیا مطلب؟ سیدھا سادہ سوال ہے۔ دیکھو اگر اس کی شادی نہیں ہوئی تو......"

مجتبیٰ نے ان کو پھر سے گھور کر اٹھنے میں ہی عافیت جانی۔ ان کے جانے کے بعد' دادی امی سے کہنے لگیں۔

"اس لڑکی کا پتا لگانا چاہیے۔ دیکھو' جب سے حیدر یونی ورسٹی سے آیا ہے اس کی زبان پر اپنی دوست کا ہی نام ہے۔"

☆☆☆

پلوشہ فراز کے ساتھ پہلی ملاقات کافی فلمی تھی۔ ٹکرانا' اس کے ہاتھ سے چیزوں کا گرنا اور اس کا اٹھا کر دینا...... جو نیا تھا' وہ اس کا رویہ تھا۔ وہ کٹھور نہیں تھی' نہ ہی روڈ تھی۔ اس نے بس کسی ذاتی وجہ سے خود کو خول میں بند کیا ہوا تھا اور وہ جانتا تھا کیونکہ یہی تو وہ بھی کر رہا تھا۔ اندر سے ٹوٹ چکنے کے بعد' اپنے گرد مضبوط' انہی خول چڑھانے کا فن وہی تو جان سکتا تھا۔

معاً حیدر کسمسایا۔

"ممّا......" حیدر کی آواز پر وہ جامد ہو گیا۔ وہ اکثر خواب میں بولتا تھا اور یہ کائنات کی عادت بھی تھی۔ کیا اس کا بیٹا' اپنے کزنز کو اپنی ماؤں کو پکارتے' ان کی لاڈ اٹھاتے دیکھ کر' احساس کمتری کا شکار ہو رہا تھا۔ کیا ایسا ممکن تھا؟

امی کی باتیں اس کے کانوں میں گونجنے لگیں۔

"ابھی حیدر چھوٹا ہے' جلدی اٹیچ ہو جائے گا تم شادی کر لو۔ اپنے لیے نہ سہی' حیدر کے لیے۔"

پہلی بار' اس کا ذہن شادی کے بارے میں سوچنے لگا تھا۔

☆☆☆

"حیدر کی پیدائش کے دوران ہی مجتبیٰ کی وائف کی ڈیتھ ہو گئی تھی۔ بہت پیارا کپل تھا۔" شائلہ اس کو بتا رہی تھی۔ اس کا دل اچانک اداسیوں سے بھر گیا۔

شائلہ اس کی کلاس فیلو رہی تھی۔ اس لیے وہ اس کو بہت قریب سے جانتی تھی۔

"کائنات میری کلاس فیلو تھی' کالج اور اسکول میں۔ پھر اس نے الگ سبجیکٹ لے لیا اور ایسے میں' میں اور مجتبیٰ یونی فیلوز ہو گئے۔ کائنات بہت زندہ دل لڑکی تھی۔ اس کی موت بہت اچانک ہوئی۔ وہ بہت صدمے میں تھا۔ کائنات کی موت کے بعد مجتبیٰ بالکل بدل گیا۔ اس کو دیکھ کر مجھے بہت دکھ ہوتا ہے۔ وہ شاید کائنات کو ابھی تک بھلا نہیں سکا کیونکہ اس

نے دوسری شادی ابھی تک نہیں کی ہے۔" شمائلہ نے اس کے دل میں ابھرتے سوالات کے جوابات اس کے پوچھنے سے پہلے ہی دے دیئے تھے۔

وہ دل ہی دل میں شرمندہ ہو رہی تھی۔ وہ اس انسان کے ساتھ ابھی تک کتنی سرد مہری کا مظاہرہ کرتی رہی تھی۔ اس کی آنکھیں بتاتی تھیں۔ ان میں کتنے بھید چھپے تھے۔ بالکل اس کی طرح۔

ایسے میں مجتبیٰ داخل ہوا۔ شمائلہ نے اس کو آتے دیکھ کر اس کی بائیوگرافی سنانا بند کی۔ مجتبیٰ سلام کرتا ہوا آگے بڑھا اور لیپ ٹاپ نکال بیٹھ گیا۔ پلوشہ نے دیکھا۔ آج وہ بہت بدلا بدلا سا لگ رہا تھا۔

شمائلہ اپنی پلیٹیں لے کر چلی گئی۔ اب آفس میں وہ اور مجتبیٰ اکیلے تھے۔

وہ اپنی جگہ بیٹھی اس شش و پنج میں انگلیاں مروڑتی رہی کہ اس کو اپنے رویے کی معافی مانگنی چاہیے یا نہیں۔ نظروں کے حصار کی حدت محسوس کرتے ہوئے مجتبیٰ نے نظریں اٹھا کر اس کو دیکھا اور یک دم پلوشہ اس کی نظروں کی تاب نہ لاتے ہوئے سرخ ہو گئی۔

"وہ مجھے آپ سے سوری کرنی تھی۔" تو پلوشہ نے اپنی شرمندگی چھپانے کے لیے فوراً کہہ دیا۔

"کس لیے؟" اب کی بار مجتبیٰ نے لیپ ٹاپ بند کیا۔ اس کی مکمل توجہ پا کر وہ اور بھی گھبرا ہو گئی۔

"اپنے پرانے رویوں کے لیے۔" اس نے نظریں جھکائیں۔

"میں آپ سے بلاوجہ روڈلی بات کرتی رہی۔ سوری فار دیٹ۔"

"کوئی بات نہیں مجھے وہ روڈ نہیں لگا تھا۔ آپ اپنی جگہ ٹھیک تھیں۔ آپ کو کسی اجنبی سے مدد نہیں لینی چاہیے تھی۔" وہ مسکرایا۔ مسکراتے وقت اس کے دائیں گال میں ایک چھوٹا سا گڑھا بن جاتا جس کو شیو نے چھپایا ہوا تھا۔

(کیا وہ اس کو اتنا غور سے دیکھ رہی تھی؟...... پلوشہ خود سے پوچھ رہی تھی۔

"حیدر کیسا ہے؟"

"ٹھیک ہے الحمدللہ۔ کل ساری رات دادی کو اپنی نئی دوست کے قصے سناتا رہا تھا۔" وہ مسکرایا۔

وہ بھی جواباً ہلکا سا مسکرائی۔

"او کیوٹ!"

☆☆☆

"میں آپ سے خفا ہوں حیدر!" پلوشہ حیدر سے مصنوعی خفگی بھرے لہجے میں پوچھ رہی تھی۔ حیدر ٹیبل پر بیٹھا پلوشہ کو دیکھ رہا تھا۔

"کیوں؟"

"آپ آئے کیوں نہیں اتنے دن؟"

حیدر نے پھر سے کندھے اچکائے۔ "پاپا نہیں لے کر آتے۔"

"آپ کے پاپا بہت برے ہیں نا۔" اس نے تائید چاہتی نظروں سے حیدر کو دیکھا۔ معاً کوئی کھنکھارا۔ پلوشہ نے نظریں گھما کر دیکھا دروازے میں مجتبیٰ کھڑا تھا۔ پلوشہ کا چہرہ یک دم شرمندگی سے سرخ ہو گیا۔

"نہیں۔ پاپا تو بہت اچھے ہیں۔" حیدر ٹیبل سے اترا اور مجتبیٰ کی طرف بھاگا۔ مجتبیٰ نے اس کو اٹھا کر گلے لگایا۔

"آپ اس کے ساتھ تھوڑی دیر رہ سکتی ہیں؟ میری میٹنگ ہے۔ کچھ دیر کے لیے۔ ابھی میری مما اور بھابھی آئیں گی اس کو پک کرنے۔ تب تک کے لیے۔" مجتبیٰ اس سے کہہ رہا تھا۔

"شیور!"

"آپ اپنی فرینڈ کے ساتھ چل کرو۔ میں آتا ہوں اوکے۔" وہ حیدر کو تاکر کہہ رہا تھا۔

"اوتے (اوکے)" حیدر خوشی سے اترا کر بولا۔

مجتبیٰ کے جانے کے بعد وہ اس کے ساتھ بیٹھی کھیلتی رہی۔ جانے کیوں حیدر کے ساتھ ایک عجیب سا

ابت تھی۔ وہ اپنا کام بھول کر اس کی معصومیت میں کھو گئی۔ کچھ دیر بعد چوکیدار آیا تو وہ حیدر کو باہر لے کر نکلی۔

ڈیپارٹمنٹ کے سامنے گاڑی کھڑی تھی اور ایک بڑی عمر کی خاتون نکل رہی تھیں۔ اس نے سلام کر کے حیدر کو ان کے حوالے کیا۔ اندر سے ایک بزرگ خاتون نے آواز لگائی۔

"اے لورے (بیٹی) ادھر آنا ذرا۔"

وہ حیرت سے مڑی۔ اس نے بزرگ خاتون کو سلام کیا، شاید یہ مجتبیٰ کی دادی تھیں۔

"کیسی ہو بیٹا۔ کیا نام ہے آپ کا؟"

"پلوشہ۔" وہ مروتاً مسکرا کر بولی۔

"کتنا پیارا نام۔ ماشاءاللہ۔ کہاں کی ہو۔"

"سوات۔"

"اسی لیے بالکل حوروں جیسا حسن رکھتی ہو۔ شادی ہوئی ہے؟" دادی کے صاف گو لہجے پر صدف بھابھی نے ان کو ٹوکا تھا۔ پلوشہ کا چہرہ ایک دم تاریک ہوا۔ وہ شاید اس سوال کی توقع نہیں کر رہی تھی۔

"ہوئی تھی۔" توقف کے بعد بولی۔

"میں چلتی ہوں۔ مجھے میں اپنا کام مکمل کرنا ہے۔ آپ سے مل کر اچھا لگا، آنٹی۔"

وہ اتنا کہہ کر جلدی سے مڑی۔ پیچھے اس نے خاتون کو کہتے سنا تھا۔

"دادی آپ نے اس بے چاری کو شرمندہ کر دیا۔ آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔"

☆☆☆

سیما باجی کافی عرصے بعد آئی تھیں۔ اگرچہ گھر میں مجتبیٰ کی شادی کا ذکر ختم ہو چکا تھا لیکن پھر بھی دادی دبے دبے لفظوں میں اس موضوع کو ہوا دے دیا کرتی تھیں۔

"ایسی خوب صورت لڑکیاں تھیں، نجمہ کی شادی میں۔ اللہ امی کیا بتاؤں۔ ایک لڑکی اتنی پسند آئی کہ خود پر قابو نہ پا کر اس کی تفصیلات تک لے لیے۔ وہ ماڈل ٹاؤن میں فارمیسی اسٹور نہیں ہے، اس کے مالک کی بیٹی ہے۔ پیاری بھی اور تعلیم یافتہ بھی۔"

سیما باجی اگرچہ پرجوش لہجے میں بتا رہی تھیں، لیکن چہرے پر اداسی بھی طاری تھی کہ کیا فائدہ؟۔

"سیما باجی! ایک بات کا اضافہ کرنا بھول گئیں آپ۔ کہ وہ کنواری ہے۔ اور کوئی بھی یہ نہیں چاہے گا کہ ان کی بیٹی کو منہ دکھائی میں تین سالہ کا بیٹا دیا جائے۔" صدف بھابھی ناک بھوں چڑھا کر ناگواری سے بولیں۔

"تو میرا بھائی کون سا انکل شنکل ہے۔ ابھی کیا عمر ہوگی اس کی۔ اکتیس بتیس۔ اس عمر میں تو تمہارے میاں نے شادی کی تھی بھئی۔" سیما باجی کو صدف بھابھی کا ٹوکنا ہمیشہ سے ناگوار گزرتا تھا آخر میں نتھنے پھلا کر اضافہ کیا۔

"مجتبیٰ کے بعد سب سے بڑی مخالف تم ہی ہو اس شادی کی۔ اپنی بہن کی جگہ تم کسی اور کو نہیں دے سکتیں۔ مان لیا۔ کم از کم اس معصوم بھانجے کا ہی خیال کر لو۔"

سیما باجی کے یوں اچانک طنز نے صدف باجی کا دل چیر ڈالا۔ باقی سب کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے حیرت سے۔ صدف بھابھی کے تاثرات بدلے اور آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

"سیما!!" دادی نے غصے سے ٹوکا۔ "کیا اول فول بکے جا رہی ہو۔ جب بھی آتی ہو، ہنگامہ کرنا فرض سمجھ لیا ہے کیا تم نے؟"

"ہاں! بھئی...... میں ہی غلط ہوں اس میں۔ اور میں ہی بے غیرت ہوں جو ہر دفعہ اپنے بھائیوں کی خوشیوں کی خواہش کا اظہار کر کے یہاں بے عزت ہوتی ہوں۔" سیما باجی فوراً اٹھیں۔

"اب ایک نیا تماشہ۔" دادی اپنی پوتی کی رگ رگ سے واقف تھیں، اس لیے ناک بھوں چڑھا کر بولیں۔

صدف بھابھی خاموشی سے وہاں سے اٹھ کر چلی گئیں اور باقی سب سیما باجی کو روکنے کے لیے اٹھے۔ ایسے میں مجتبیٰ اپنے کندھے پر حیدر کو بٹھائے

اندر داخل ہوا۔ لاؤنج میں ہنگامہ دیکھ کر رکا۔ اس کو دیکھ کر سیما باجی رو پڑیں۔

"کیا ہوا ہے باجی۔؟" وہ حیدر کو اتار کر ان کی جانب لپکا۔

"وہی پرانی بات۔" سیما باجی کے بجائے امی نے جواب دیا۔

"تمہاری شادی۔ کیوں اپنی ضد پر اڑ گئے ہو مجتبیٰ! لوگ تمہاری منتیں کر کے تھک چکے ہیں۔ ہر روز کوئی نہ کوئی دل خفا کر کے چلا جاتا ہے۔ صرف تم نے ہی غم نہیں جھیلا' ہم بھی جھیل رہے ہیں۔ اپنے لیے نہ سہی' حیدر کا ہی سوچ لو اب۔" پہلی بار امی کے لہجے میں منت نہیں' غصہ تھا۔ سب تھم سے گئے۔ سیما باجی بھی اپنے آنسو روک کر مجتبیٰ کو دیکھنے لگیں۔

مجتبیٰ نے پیچھے مڑ کر حیدر کو دیکھا' جو کرسی کے ساتھ کھڑا احمد ان کو دیکھ رہا تھا جو شائستہ بھابھی کی گود میں تھا۔ پہلی بار اس کو اپنی ضد بے جا لگی اور دل موم کی طرح پگھل گیا۔

"ٹھیک ہے۔ جب آپ لوگوں کی خوشی اسی میں ہے تو مجھے قبول ہے لیکن......" پل بھر کے لیے تھما "یہ حیدر کی پسند پر ہوگا۔"

اور نیچے بیٹھی دادی کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو جھلملا گئے۔ وہ جانتی تھیں کہ حیدر کی پسند کون تھی؟

وہ' جو اس کی فرینڈ تھی......!

☆☆☆

مجتبیٰ کی ہتھیلیاں پسینہ پسینہ ہو رہی تھیں۔ اس کے سامنے بیٹھی پلوشہ اس کو حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ وہ اس کے بولنے کے انتظار میں تھی۔

"شائلہ نے آپ کے ماضی کے بارے میں بتایا۔" مجتبیٰ نے تمہید باندھی اور توقف کیا۔ پلوشہ نے نچلا لب کاٹا۔ ایک دم سے اس کا چہرہ تاریک ہوا۔ کبیر کا غصہ' اس کی وحشت' طلاق...... سب کچھ ایک ہوم سے اس پر آوار د ہوا۔ مجتبیٰ نے اس کے بدلتے تاثرات غور سے دیکھے تھے۔

"میں اکثر سوچتا تھا کہ آپ کی اداسی کے پیچھے کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ مجھے ایسا لگتا تھا کہ ہم میں ایک چیز کامن ہے اور وہ تھی...... شادی...... ایک ناکام شادی اور ایک ختم ہو چکی شادی......" ایک اداس مسکراہٹ اس کے چہرے پر آن ٹھہری۔

"گھر والوں نے مجھے بہت فورس کیا دوسری شادی پر۔ لیکن مجھے یہ کائنات کے ساتھ بے وفائی لگتی تھی۔ میں دوسری شادی نہ کرنے کی ضد پر اڑا رہا اور یہ ضد تب ٹوٹی' جب میں نے حیدر کی نفسیات پر غور شروع کیا۔ وہ جب مجھ سے خفا ہوتا ہے' یا اکیلا محسوس کرتا ہے تو وہ کہیں چھپ جاتا ہے۔ پھر میں نے غور کیا...... وہ جب جب اپنے کزنز کو اپنے والدین کے ساتھ دیکھتا ہے تو تب بھی وہ ایسا لاشعوری طور پر کرتا ہے...... امی ٹھیک کہتی تھیں' ابھی وہ چھوٹا ہے...... دوسری ماں کو قبول کر لے گا...... بڑا ہو کر وہ اپنی ماں کی کمی کو بہت محسوس کرے گا اور یہ احساس اس کی ان سکیورٹی نہ بن جائے۔"

پلوشہ یک ٹک اس کو سنتی جا رہی تھی۔ شاید پہلی بار دونوں نے خود اپنے ارد گرد بنائے خول کو توڑ کر اپنی کہانی شیئر کی تھی۔

"اتنی لمبی تقریر کے بعد' اصل مدعے پر آتا ہوں۔ میں نے شادی کے لیے ہاں کر دی لیکن میں چاہتا ہوں کہ یہ فیصلہ حیدر کی پسند پر زیادہ ہو......اور وہ اتنے عرصے میں پہلی بار کسی کو دل سے فرینڈ بنا چکا ہے......" مجتبیٰ اس پر نظریں گاڑے کہہ رہا تھا اور پلوشہ کا منہ حیرت سے کھل گیا اور یک دم چہرہ لال ہو گیا۔ کیا وہ......؟

"کیا آپ حیدر کی پرمننٹ فرینڈ بنیں گی؟ اس کے ساتھ ہمیشہ کے لیے اس کے گھر میں رہ کر......؟ آئی نو' آپ کے لیے یہ بہت ویرڈ (عجیب) ہو گا۔ اور مشکل بھی۔ لیکن......" مجتبیٰ خاموش ہو گیا' یوں جیسے بہت تیاری کے بعد کہی گئی باتیں ختم ہو چکی ہوں اور اس کے پاس مزید کہنے کے لیے الفاظ نہیں تھے۔

پلوشہ فوراً اٹھی۔ اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔

مجتبیٰ بھی فوراً اٹھا۔ "اگر آپ کو برا لگا ہو تو آئی ایم ریئلی سوری...... آپ کے جواب کا انتظار رہے گا۔"

پلوشہ رکی۔ مجتبیٰ اس کو منت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"میں شمائلہ کو بتا دوں گی۔" اتنا کہہ کر وہ فوراً باہر نکلی۔

☆☆☆

وہ کھڑکی کے پار دیکھ رہی تھی، جہاں مین گیٹ سے وہ لوگ داخل ہو رہے تھے۔ ہنستے چہرے، خوش لباس لوگ۔ مجتبیٰ کی دادی، جریب ٹیکتی آنکھوں میں خوشی کے آنسو لیے داخل ہو رہی تھیں۔

اس کا دل تیزی سے دھڑکتا جا رہا تھا بالکل اسی طرح...... جب مجتبیٰ نے اس کو پرپوز کیا تھا۔ ساری رات وہ بے چینی سے کبھی لیٹ جاتی اور کبھی کمرے میں جلے پیر کی بلی بنی اضطراب میں چہل قدمی کرتی۔ وہ دو عدالتوں کے بیچ معلق تھی۔ ایک عدالت اس کے دل کی تھی اور ایک اس کے ذہن کی۔

وہ خود کو ایک نئے رشتے کے لیے آمادہ نہیں کر پا رہی تھی اور وہ بھی ایک ایسے مرد کے ساتھ، جو اپنی پہلی بیوی کو ٹوٹ کر چاہتا رہا ہو...... یا اس کے اعتبار کے زخم ابھی ہرے تھے۔

پھر اس کا دل کہہ رہا تھا کہ اس اداس آنکھوں والے شخص کا دل کتنا صاف تھا۔ اس کے بقول اس کی مردوں کے بارے میں رائے 'بائیسڈ' (متعصب) تھی۔ وہ کبیر کے معیار پر، مجتبیٰ کو ناپ رہی تھی۔

اور ان سب باتوں سے برطرف، اس کا دل مجتبیٰ کو دیکھ کر دھڑک کیوں جاتا تھا؟ کیا وہ اس سے محبت کرنے لگی؟ اس کا جواب جتنا مبہم تھا، اتنا ہی واضح بھی...... بس وہ خود اقرار نہیں کر پا رہی تھی

بلا آخر جب وہ تھک ہار چکی، تو مینو کو کال ملا کر پوری کتھا سنا ڈالی۔ مینو سنتے ہی چیخ پڑی تھی، اس نے فوراً امی کو فون پکڑایا۔ پہلے تو اس شرم سے وہ نروس ہو گئی پھر سنبھل کر امی کو سب کچھ بتا دیا تو امی نے فیصلہ اس پر چھوڑ دیا اور یہ بھی کہا کہ اگر وہ ان کو رشتے بھیج دینے کا کہنے کا ارادہ رکھتی ہوں ...... تو زہے نصیب۔

امی کے یوں پلو جھاڑ کر، ایک طرف ہو جانے پر اس کو مزید مضطرب کر دیا۔ ساری رات حیدر کا چہرہ اس کے سامنے گھومتا رہا۔ اس کی اداس آنکھیں۔

صبح کی نیلگوں روشنیوں میں جب سفیدی گھل مل رہی تھی، تو اس نے شمائلہ کو ٹیکسٹ کیا۔ شمائلہ کا فوراً جوابی ٹیکسٹ آیا تھا۔

"اوہ مائی گاڈڈڈڈڈڈ!!!!!"

پھر انہوں نے جس دن آنے کا کہا تو وہ گھر آ گئی۔

ابھی وہ کھڑکی میں کھڑی، دیکھ رہی تھی کہ ایسے میں مینو داخل ہوئی۔ مینو کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔

"اللہ! پلوشہ باجی...... کسی سلطنت کے شہزادہ لگ رہے ہیں مجتبیٰ بھائی تو......"

اس نے یقیناً بیٹھک کے دروازے کی جھری میں سے دیکھ لیا ہوگا۔ "اور گھر والے...... ایسے خوش مزاج...... ان کی دادی اور امی کی تو مانو دوستی ہو گئی ہے۔" مینو ہنس ہنس کر کہہ رہی تھی۔ "چلیں...... تیار ہو جائیں اور جلدی سے کچن میں آئیں۔"

ان کے لیے پلوشہ کا رشتہ آنا اور وہ بھی ایسے اچھے خاندان سے غنیمت ہی تھا۔ ابو نے ان کے آنے سے پہلے ان کے خاندان کے بارے میں اچھی خاصی معلومات حاصل کر لی تھیں۔ جنہوں نے یہ معلومات فراہم کیں، وہ مجتبیٰ کی خاندان کے تعریفوں میں رطب اللسان تھے۔ ابو کے کندھوں سے بوجھ ہلکا ہوا اور سکھ کی سانس بھری۔

☆☆☆

"ہوٹل میں ٹھہرنے کی کیا ضرورت تھی بھلا؟" امی خفگی بھرے لہجے میں دادی سے کہہ رہی تھیں۔

وہ سب لوگ سوات آئے ہوئے تھے۔ ایک تیر سے دو شکار۔ رشتہ بھی مانگ لیا اور سوات کی سیر بھی۔

"زیتون بیٹا! اب تو ٹھہرنے تب آئیں گے جب پلوشہ کے ساتھ دریمہ (شادی کے بعد دلہن کا آنا) میں آئیں گے۔" دادی نے مسکرا کر کہا۔

ایسے میں ہلکے پیازی رنگ کے کپڑوں میں ملبوس' پلوشہ چائے کی ٹرالی دھکیلتی داخل ہوئی۔ سیما باجی' جنہوں نے آنے سے پہلے خوب واویلا مچایا ہوا تھا کہ ایک طلاق یافتہ لڑکی سے رشتہ کیوں کیا جا رہا ہے؟ اب ان کا منہ پلوشہ کی خوب صورتی دیکھ کر کھلا کا کھلا رہ گیا۔ باقی بھابھیاں بھی حیرت بھری خوشی سے دیکھ رہی تھیں۔ ایسی پری وش لڑکی کو کوئی کیوں کر طلاق دے سکتا ہے؟......!

"وائی زار و قربان!" دادی فرط جذبات سے رو ہی پڑیں۔ "وائی زار! دلتہ راشہ (ادھر آؤ) میرے پاس بیٹھو۔" پلوشہ قدم اٹھاتی' دادی کے پہلو میں بیٹھ گئی۔ دادی نے اس کے ماتھے پر پیار کیا۔

"یہ تو بدری جمالہ پری ہے۔ اتنی پیاری ماشاء اللہ۔" دادی اب زیتون کی اور مڑیں۔

"دیکھو زیتون بیٹا' آئے تو اس امید سے تھے کہ رشتہ ہو جائے لیکن اب تو جائیں گے ایک ہی صورت میں کہ یہ حور جیسی بیٹی ہمیشہ کے لیے میری بیٹی ہو جائے۔" دادی کا منت بھرا لہجہ آخر میں سخت ہو گیا۔

زیتون بی بی ان کی بات پر ہنس پڑیں۔ وہ جو اپنے میاں کے ساتھ رات کو ہی فیصلہ کر چکی تھیں' مسکرا کر بولیں۔

"اپنی بیٹی کے ہاتھوں سے بنی چائے پی لیجیے ورنہ ٹھنڈی ہو جائے گی!!"

☆☆☆

"دادی آپ بتائیں' آپ کے وقت میں شادی کس طرح ہوتی تھی۔ بالکل اسی انداز میں کرتے ہیں۔ اپنے آبائی گاؤں جا کر۔ یہ شادی ہال میں نہیں کرتے۔" ارسلان بھائی دادی سے کہہ رہے تھے۔

دادی مسکرائیں۔ "اب تو حافظہ اتنا کمزور ہو چکا ہے کہ کیا بتاؤں۔ جو جو یاد آتا ہے' وہ بتاتی ہوں۔"

سب دادی کے کمرے میں گھیرا ڈالے بیٹھے تھے۔ شائستہ بھابھی چائے کی ٹرے لے کر اندر داخل ہوئیں اور صدف بھابھی نے ٹرے میں' ڈرائی فروٹس رکھ کر سب میں تقسیم کر دیے۔

"سب سے پہلے تو تاریخ طے ہونے پر' خاندان کے سارے مرد درختوں کی لکڑیاں کاٹ کر لاتے ہیں۔ سارے گھر کے چونے شروع کرتے' سڑک والی دیوار پر 'شادی مبارک' چونے سے لکھی جاتی جو اس بات کی نشاندہی کرتی تھی کہ اس گھر میں شادی ہو رہی ہے۔"

وہ لوگ اپنے آبائی گھر ورسک روڈ پر آباد اپنے گاؤں جا رہے تھے۔ گاؤں میں مقیم سارے خاندان کے لڑکے جنگل سے درخت کاٹ کر لا رہے تھے۔ گھر کے کچے صحن میں خواتین بیٹھی فنجان (گول کٹورہ نما پیالی) میں گڑ کی چائے پی رہی تھیں۔ دور کھڑی لڑکیاں تصویریں بنا رہی تھیں اور انسٹاگرام اسٹوریز اپلوڈ کیے جا رہی تھیں۔

"پھر ہر گھر میں مہندی بھیجی جاتی تھیں۔"

پڑوس میں اکبر ماما کے صحن میں کھڑی بریرہ (سیما باجی کی بیٹی) اپنی پھپھو کی بیٹیوں کے ساتھ کھڑی پرات میں مہندی دے رہی تھی۔

"اللہ نصیب اچھے کرے' مجتبیٰ خان کی! دلہن سوات کی ہے...... اتنی دور؟"

"جی اتنی دور......"

"سب کو تو سونے کے کڑے وغیرہ بھی دیئے ہوں گے انہوں نے۔ ان کی تو روایت ہے کہ

گھونٹ (دعائے خیر) کے بعد لڑکے کی بہنوں بھابیوں کو زیور دیتے......"

"وہ دادی نے منع کر دیا۔" بریرہ تنگ کر بولی۔

"اور تم لوگوں نے دیئے پیسے؟"

"کس چیز کے؟" بریرہ اب چڑنے لگی، ہر جگہ یہ بات سن سن کر......

"یہی......" خاتون اشارے سے سمجھاتی۔

"یہی کیا، خالہ؟"

"وہ لوگ لیتے ہیں نا دلہن کے سر پر پیسے۔" جملہ مکمل کرنے کے بعد کھسیانی ہنسی ہنس دیے۔

بریرہ نے اس "دقیانوسی سوچ" پر ان کو پہلے گھورا اور پھر تنگ کر بولی۔

"خالہ! وہ سر پر نہیں لیتے......وہ بھی ان کی روایت ہے کہ اتنا بھاری بھر کم جہیز دیتے ہیں وہ لڑکی کو۔ تو لڑکے والے انہیں لڑکی کے کپڑوں کے پیسے دیتے ہیں جتنی استطاعت ہو۔ جیسے ہم خود بناتے ہیں دلہن کے کپڑے۔ لڑکے والے یہ زحمت بھی انہیں کرنے دیتے ہیں۔ اچھا خالہ، انٹرویو ختم ہو چکا ہو تو برات دے دیں۔"

"اچھا تو جہیز دیں گی وہ؟"

"خالہ برات......؟" بریرہ اب چڑ گئی تھی۔

گھر آ کر اس نے برات بیچ دیا۔ "یہ ٹریڈیشنل ویڈنگ کا آئیڈیا جس کا بھی تھا، انہیں یہ کام اب خود کرنے چاہئیں۔ میرا تو ہر کسی کو جواب دے دے کر منہ سوکھ گیا بلڈ پریشر الگ بڑھ گیا۔"

ساری خواتین ہنس پڑیں۔

"مزید کچھ میرے وقتوں والا کرنا ہے؟ بیل گاڑی والی بھی ایک روایت اور ڈھولی بھی بناتے ہیں۔" دادی نے لکڑیاں توڑتے ارسلان سے شرارت سے ہنس کر پوچھا۔

ارسلان بھائی ہانپتے کانپتے پیچھے مڑے۔ "بس دادی! اب نکریزے (مہندی) کا ٹریڈیشن ہی رہنے دیتے ہیں۔ میری توبہ!"

ساری خواتین ہنس پڑیں۔

☆☆☆

نکاح کے وقت دادی نے اپنے سرخ دوپٹے کو نکالا اور پیار سے پلوشہ کے سر پر رکھا، جس پر انہوں نے پلوشہ کا نام لکھا تھا اور اس کو سیتے چار ماہ لگا دیئے تھے۔ حجلہ عروسی میں بیٹھی پلوشہ کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ اس کے گالوں کی حدت ہی نہیں ختم ہو رہی تھی۔ وہ کسی خواب کی کیفیت میں تھی۔

ایک نئی زندگی کی شروعات اور وہ بھی بالکل مختلف حالات کے ساتھ۔

ایک نئی نویلی دلہن، جو نکاح کے فوراً بعد تین سال کے بیٹے کی ماں بن چکی تھی۔ کچھ دیر پہلے حیدر اس کے پاس سے گیا تھا۔ دادی نے اس کو سمجھایا کہ اس کی دوست اب اس کی ماما بن گئی ہے اور حیدر اس ماما کے لفظ پر اتنا خوش ہوا کہ وہ بار بار دادی سے پوچھتا تھا......

"میری ماما؟ دادو......میری ماما؟" وہ خوشی سے یقین چاہنے والے انداز میں پوچھتا اور اس کے انداز پر پلوشہ کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ اس کو اپنے فیصلے پر خوشی ہوئی......ایک عجیب احساس تھا، جو دل پر بھاری تو تھا لیکن وہ اس کو نام نہیں دے پا رہی تھی۔ شاید وہ حیدر کو اپنا بیٹا تسلیم کر چکی تھی......!

شاید نہیں......یقیناً۔

وہ حیدر کا ماتھا چومتی اور دادی رو پڑتیں۔ سیما باجی نے دادی کو روکا۔

"دلہن ہے دادی ابھی۔ کیا کر رہی ہیں آپ۔ حیدر کو ابھی مت بھیجیں۔"

جب حیدر اس کے پاس سو گیا، تو اس کو شائستہ بھابی اپنے پاس سلانے لے کر چلی گئیں۔ اس کا دل چاہا کہ ان کو روکے لیکن کچھ کہہ نہ پائی۔ کچھ دیر بعد جب باہر شور کم ہوا تو مجتبیٰ اندر داخل ہوا اور اس کے آتے ہی کمرہ اس کی مخصوص خوشبو سے مہک اٹھا۔

مجتبیٰ اس کے پاس بیٹھا، گھونگھٹ کے پار اس کے مردانہ ہاتھ، رگیں ابھرے دکھائی دے رہے تھے۔ یک دم سے اس کا دل گھبرانے لگا۔

مردانہ ہاتھ...... مرد کی قربت......

ایک دم سے ماضی کی کھڑکیاں دھڑ۔۔ سے کھلیں اور گھونگھٹ کے پار مجتبیٰ کی جگہ' کبیر نے لے لی۔ معاً کبیر کے ہاتھ بڑھے اور اس کا گھونگھٹ اٹھایا۔ وہ یک دم پیچھے ہٹی اور گلے پر ہاتھ رکھا یوں جیسے ابھی اس کے ہاتھ پلوشہ کے گلے کی طرف بڑھنے والے تھے۔

آنسو کی ایک لمبی لکیر اس کی وحشت سے پر آنکھوں سے بہنے لگی۔ چہرہ زرد پڑ گیا تھا

''آر یو اوکے۔'' مجتبیٰ جو حیرت سے پوچھ رہا تھا' اس نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑا اور پلوشہ نے یک دم اس سے ہاتھ چھڑایا۔

''پلوشہ؟'' مجتبیٰ کی نظریں حیرت سے کھلی رہ گئی کی کھلی تھیں۔ اس نے ایک بار پھر سے اس کا ہاتھ پکڑنا چاہا۔ لیکن پلوشہ نے فوراً اسے خود کو دور کیا۔ وہ گہری سانسیں لے رہی تھی۔ مجتبیٰ حیران پریشان اس کو دیکھتا جا رہا تھا۔ اس کا مسلسل رونا' ردعمل سمجھ ہی نہیں پا رہا تھا۔ معاً وہ اٹھا۔ سائیڈ ٹیبل سے پانی کا گلاس بھرا اور اس کو پیش کرنے لگا۔

''پلوشہ! کام ڈاؤن پلیز...... میں تمہاری مرضی کے بغیر ہاتھ نہیں پکڑوں گا...... یہ میرا وعدہ ہے تم سے...... یہ لو پانی پیو!'' وہ نرمی سے کہہ رہا تھا ۔ پلوشہ رخ موڑے ہوئے' ویسے ہی گہری سانسیں بھر رہی تھی۔

کچھ دیر کے لیے ان کے درمیان خاموشی چھائی رہی' جب پلوشہ کا خوف تھوڑا کم ہوا تو اس نے مڑ کر دیکھا...... مجتبیٰ ہنوز پانی کا گلاس لیے کھڑا تھا۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ پلوشہ نے نظریں چرا کر' گلاس پکڑا لیکن تب تک کافی دیر ہو چکی تھی ......کیونکہ......

مجتبیٰ کو ان نظروں نے ساری کہانی سنا دی تھی۔

☆☆☆

صبح کی البیلی روشنیاں' نئے نکور ہلکے جامنی سلک کے پردوں کے پار ہوتی' اندر ایرانی قالین پر استراحت فرمانے کی سر توڑ کوشش کر رہی تھیں۔ باہر سے ہلکی ہلکی آوازوں کا شور' اس کے کانوں میں پڑ رہا تھا۔ اس کی رات کو کب آنکھ لگی' پتا ہی نہیں چلا۔ مجتبیٰ کے جانے کے بعد' وہ دیر تک بیٹھی شرمندہ ہوتی رہی۔ اب اس کا دل دھڑکتا جا رہا تھا کہ وہ مجتبیٰ سے نظریں کیسے ملا پائے گی؟......

معاً دروازے پر دستک ہوئی۔ امی کی مہربان آواز آئی۔ ''پلوشہ بیٹا!''

وہ فوراً اٹھی' جلدی سے دروازہ کھولا۔

''صبح بخیر بیٹا!'' امی نے آگے بڑھ کر' اس کا ماتھا چوما۔ ''تم جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ تاکہ سب ناشتہ کر لیں ایک ساتھ۔ تمہارے انتظار میں بیٹھے ہیں سب۔''

امی یہ کہتی مڑ گئیں اور وہ کچھ لمحوں کے لیے وہیں شل کھڑی رہی۔ اس کے کانوں میں تائی کی آواز گونج رہی تھی۔

''بیٹا' شادی کے پہلے دن یہ سبق ذہن نشین کر لو کہ گھر کے بڑے اور مرد سب سے پہلے ناشتہ کرتے ہیں...... اس لیے ناشتے کے لیے جلدی اٹھا کرنا......''

وہ سر جھٹکتی مڑی۔ صدف بھابھی نے پہلے سے ہی ان کے لیے پہلے دن کے کپڑے منتخب کر کے رکھے ہوئے تھے۔ اس لیے وہ جلدی سے تیار ہو کر ڈائننگ روم جانے لگی۔ جہاں سب گپیں ہانک رہے تھے۔ ارسلان بھائی مسکراتے ہوئے مجتبیٰ کی ٹانگ کھینچ رہے تھے۔

''ویسے دادی! چونکہ یہ شادی تو ہمارے پرانی روایتوں پر ہوئی ہے۔ تو ایک روایت میں بھی یاد دلاتا چلوں کہ دولہا شادی کے پہلے تین دن حجرے میں گزارتا ہے...... اس لیے قواعد و ضوابط کے عین مطابق اس نئے دولہا میاں کو حجرے میں ہونا چاہیے۔''

سب ہنسنے لگے...... سیما باجی اپنے بھائی کو

بچانے کو دیں۔

''آپ اپنی خاطر بچائے رکھیں۔ حجرہ نہیں' تو روایت نہیں۔'' آخر میں 'ہونہہ' کا اضافہ بھی......

''حجرہ نہ سہی...... بیٹھک ہی سہی......'' شائستہ بھابھی ہنس کر بولیں۔

''خود تو شادی ہال میں اپنی بیگم کے پہلو میں ایسے چپکے بیٹھے تھے کہ مانو صدیوں بعد شادی ہوئی ہو۔'' دادی نے بھی مجتبیٰ کی سائیڈ لی۔

''میاں! دولہے شادی کے بعد تین دن حجرے میں گزارتا ہیں' تم نے تو وہ شادی کے فوراً بعد میکے میں گزارے تھے۔'' حفیظ لالہ بھی کود پڑے اور ان کی بات پر سب قہقہے لگانے لگے۔

معاً دادی کی نظریں پلوشہ پر پڑیں۔'' وائی میری سوات کی پری! آؤ...... آؤ...... اٹھو مجتبیٰ۔'' دادی کے اشارے پر مجتبیٰ اٹھا اور پلوشہ کے لیے کرسی کھینچی۔ اس پر سب خوشی سے مسکرائے اور خواتین نے ''اووو'' کی آواز لگائی۔ نا صرف پلوشہ بھی شرمائی بلکہ مجتبیٰ بھی شرما کر فوراً اپنی نشست پر براجمان ہوا۔

پلوشہ نے اپنے سامنے بیٹھے مجتبیٰ کو دیکھا' اسی وقت مجتبیٰ نے بھی دیکھا۔ اس کی نظروں میں کل والی بات کا کوئی شائبہ تک نہیں تھا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ گھر والوں کے مذاق اور لطیفوں پر ہنس رہا تھا۔

کیا وہ اداکاری کر رہا تھا؟ یا وہ غصہ تھا...... کبیر کی طرح؟ جب کبیر کو اس کے میکے میں کسی کی بات بری لگتی تو تب تو وہ ہنس کر بات کرتا لیکن گھر آ کر اس پر خوب چلاتا' مارتا۔ معاً اس کی دل کی دھڑکن تیز ہونے لگی۔ وہ نچلا لب اضطراب میں کاٹنے لگی۔

☆☆☆

دوپہر تک وہ مبارکباد کے لیے آتے رشتے داروں کے نرغے میں پھنسی رہی اور مجتبیٰ بھی بیٹھک میں مہمانوں کے ساتھ مصروف رہا۔ حیدر کے اٹھتے ہی امی نے اس کو آملیٹ بنا کر دیا۔ اب اس کا فیڈر رات تک محدود ہو چکا تھا۔ جب گھر میں مہمان نہیں ہوتے' تو پلوشہ ان کے ساتھ لگی رہتی...... اس کے ساتھ کارٹون دیکھتی' یا اس کے ساتھ کھیلتی......

''ہائے' ابھی تو بچہ ہے۔ نئے مہمان کی خوشی میں' اس کے ارد گرد منڈلاتا جا رہا ہے۔ جب اس کو پتا چلے گا کہ سوتیلی ماں ہے یا اس کے خود کے بچے ہوں گے تو خود ہی پس منظر میں چلا جائے گا...... ہائے بے چارا حیدر...... اور یہ نئی بہو تو دکھاوے کے لیے کرتی ہوگی' لکھ لو میری بات۔'' دادی کی چچازاد' رضیہ خالہ آئی ہوئی تھیں' جو جاتے ہوئے برآمدے میں اپنی بہن کو کہہ رہی تھیں۔ یہ صرف اس نے ہی سنا تھا اور ان کو 'خدا حافظ' کہتی امی نے...... دونوں کی نظریں ملیں اور نا چاہتے ہوئے بھی پلوشہ کو شرمندگی محسوس ہوئی۔

جب وہ جا چکے' تو امی اس کے کمرے میں آئیں۔ ان کے ہاتھ میں دو کپ تھے۔ ایک پلوشہ کو پیش کیا۔

''چائے پیو گی' پلوشہ؟''

''اب آپ لا چکی ہیں' امی! تو پینی پڑے گی۔'' وہ خوش دلی سے مسکرائی۔

''پتا ہے' پلوشہ۔ لوگ پیٹھ پیچھے' وہی باتیں کرتے ہیں جنہیں ہم یا تو بھلانا چاہتے ہیں یا وہ ہماری کمزوری ہو۔ وہ سو فیصد سچ بھی ہو تو بھی...... ہم اس کو کہیں دفنا دینا چاہتے ہیں۔'' امی بنا اس کو دیکھے کہہ رہی تھیں۔ معاً اس کو دیکھا۔ ''اگر کبھی غلطی سے وہ باتیں سن بھی لیں تو اس پر دل برا مت کرنا...... تمہارے خلوص پر ہمیں کوئی شک نہیں ہے۔ کبھی بھی دوسروں کی اپنے بارے میں باتیں سن کر اپنی ہی نظروں میں شرمندہ مت ہونا۔'' ہاتھ بڑھا کر' اس کا ہاتھ چوما۔

پلوشہ ان کی اس محبت پر موم کی طرح پگھل گئی۔ آنکھیں بھرنے لگیں۔

''تمہاری امی کا فون آیا تھا۔ وہ لوگ ناشتہ بھیج رہے تھے' ہم نے منع کر دیا۔ اب جائیں گے نادر یمہ

کے لیے تو خوب ناشتہ بھی کر لیں گے' لنچ بھی' ڈنر بھی "امی مسکرائیں۔

☆☆☆

شام کو جب سب دادی کے کمرے میں مشغول تھے' وہ حیدر کو سلا رہی تھی۔ اگرچہ امی نے منع بھی کیا لیکن حیدر اپنی 'فرینڈ' کے پاس سے ہل ہی نہیں رہا تھا۔ پلوشہ حیدر کے ساتھ رکنے کے لیے بضد رہی تو امی بھی مسکراتی چلی گئیں یہ سوچ کر' کہ ویسے بھی ابھی مجتبیٰ آجائے گا۔ دونوں کو ساتھ بیٹھنے کا موقع مل جائے گا۔

جب حیدر سو چکا تھا' تو اس نے آرام سے اس کا ٹیب بند کیا اور کمبل ٹھیک کرتے ہوئے اٹھنے ہی لگی تھی کہ اپنی انگلی کو حیدر کے ننھے ہاتھ کے حصار میں پایا۔ اس کا دل عجیب احساسات سے بھر گیا۔ یوں بغل مارے کہیں چھپی ممتا یک دم آنمودار ہوئی......!

وہ جھک کر' حیدر کا ماتھ چومنے لگی تھی کہ ایسے میں لائٹ آن ہوئی۔ مجتبیٰ کی نظریں اس پر پڑیں۔

"لائٹ آف کردیں' حیدر جاگ جائے گا۔"

وہ لڑکی' جو حیدر کے ساتھ دو دن گزر چکی تھی' وہ اس کو حیدر کے بارے میں بتا رہی تھی۔ وہ مسکرایا اور لائٹ آف کردی۔

"ہاں...... تم ٹھیک کہہ رہی ہو' پلوشہ!" اس کا لہجہ مسکراتا ہوا تھا۔

دونوں اپنی جگہ کھڑے رہے' شام کی نیلگوں روشنیوں میں دو ہیولے نظر آرہے تھے۔ معاً ایک ہیولے اس کی اور بڑھا۔ دوسرا ہیولہ اپنی جگہ ساکت رہا۔ کلون کی خوشبو اس کی حواسوں پر چھاتی' دم گھونٹنے لگی۔ مردانہ سانسوں کی خوشبو اور اس کا ہاتھ۔ پکڑتا مردانہ ہاتھ کی گرفت......

چھناکے سے شیشہ ٹوٹا۔ کسی نے دیوار پر شیشے کا گلاس دے مارا۔ اس خاموش میں کئی شاموں کی گونج ابھری اور وحشت بے لگام گھوڑے کی مانند جو' سرپٹ بھاگنے لگا۔ کوئی چیختا تھا۔ وہی ایک جیسی آواز

کبیر کی غصے کی آواز۔

کوئی چیز ٹوٹنے کی آواز۔

کان میں گونجتے تھپڑ کی آواز۔

اس کی سانس چڑھنے لگی۔ وہ ہیولہ تیزی سے پیچھے ہوا۔ دفعتاً لائٹ آن ہوئی اور مجتبیٰ نے دیکھا کہ ایک ہی جگہ شل سی کھڑی پلوشہ' گہری سانس لیتی بے آواز رو رہی تھی۔

"پلوشہ ...... پلوشہ ......!" وہ آگے بڑھا۔ آگے بڑھ کر اس کو جھنجوڑ کر صوفے پر بٹھایا۔ پانی کا گلاس بھر کر اس کو دیا اور اس کے قدموں میں بیٹھ کر اس کو تشویش سے دیکھنے لگا۔

"آئی ایم سوری!"

پلوشہ پانی پی چکی' تو دھیمے لہجے میں بولی۔ گود میں دھرے اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ مجتبیٰ نے اس کے کانپتے ہاتھوں پر اپنا ہاتھ رکھا۔

"ڈونٹ روی!"

اب کی بار' اس کے لمس پر وہ خوف زدہ نہیں ہوئی۔ یہ لمس بہت سکون دے رہا تھا یوں جیسے کسی مہربان دوست نے اس کی روح کو چھولیا ہو ...... ایک تحفظ کا احساس ہونے لگا......

وہ حق رکھتا تھا اس پر' لیکن وہ اس کو کہہ رہا تھا کہ اس کے مرضی کے بغیر وہ اس کا ہاتھ نہیں پکڑے گا ......وہ اس کو جوتے کی نوک پر رکھ کر ٹھوکر مار سکتا تھا لیکن وہ الٹا اس کے قدموں میں بیٹھا تھا......

ہر بار وہ کبیر کے پیمانے پر اس کو ناپتی اور ہر بار وہ پیمانے کو توڑ دیتا تھا۔

☆☆☆

شادی کے بعد' اس کے گھر کی طرف سے دعوت لیٹ کروادی گئی تھی اور یہ دادی کا فیصلہ تھا۔

"میں چاہتی ہوں' زیتون بیٹا! کہ یہ دریمہ دو تین ہفتے بعد کر لیتے ہیں۔ یہاں بچوں کو بھی تھوڑا وقت مل جائے۔ پہلے سوات سے پشاور تک سفر میں' پھر مہمانوں کے نرغے میں بیٹھنے سے ذرا جو ان میاں بیوی کو فرصت ملی ہو۔" دادی آخر میں ہنس

پڑیں۔

زیتون بی بی نے نہ اصرار کیا اور نہ ہی خفا ہو بیٹھیں۔ وہ تو اس بات پر خوش تھیں کہ اتنے پیار کرنے والے گھرانے میں ان کی بیٹی کی شادی ہوئی تھی۔ پلوشہ کے لہجے کی بشاشت اور کھنک اس کے خوش ہونے کا عندیہ دیتی تھی اور زیتون بی بی کا دل پرسکون ہو جایا کرتا تھا۔

اور سچ تھا کہ پلوشہ انتہائی خوش تھی اور کبھی کبھی حیران بھی رہ جاتی تھی۔ شاید اس کی حیرانی کی اہم وجہ یہ بھی تھی کہ اس کے سامنے جو ہو رہا ہوتا تھا وہ بالکل اس کے ماضی سے الٹ تھا۔ وہاں اگر تائی، میٹھی چھری بن کر انتہائی زہریلی تھی، یہاں دادی اور امی اس کے صدقے واری جاتی تھیں...... تائی کے بالکل الٹ۔

یہاں کوئی بلاوجہ کا غصہ نہیں کرتا تھا۔ حفیظ بھائی شام کو آتے تو انہوں نے کبھی صدف بھابھی پر غصہ نہیں کیا جو چائے لاتے وقت اکثر دیر کر دیتی تھیں۔ وہ صبر سے بھابھی کا انتظار کرتے۔

ایک دن ارسلان بھائی نے شائستہ بھابھی پر غصہ کیا تھا۔ امی نے ارسلان بھائی کو تب تک معاف نہیں کیا، جب تک انہوں نے شائستہ بھابھی سے معافی نہیں مانگ لی۔

"مرد اور جانور کے بیچ کا فرق صرف ماں کی ہی طے کرتی ہے۔" دادی کہتیں۔

اس کے لیے اپنے ہی ماضی کا حال سے موازنہ حیرت میں مبتلا کر دیتا تھا۔ ایک تائی کا گھر تھا، جہاں انہوں نے پہلے تایا کے غصے کو سہہ کر اس کو تایا کا حق مان دیا اور پھر بھی اپنا جیسا بنایا۔ تائی نے تایا کو وہ سب کچھ کرنے دیا اور جو انہوں نے اپنی مردانگی کا حق مانا اور اس ماحول میں ان کے دونوں بیٹے تایا جیسے ہی پروان چڑھے...... جنہوں نے اپنی زندگی کے ساتھ دوسروں کی زندگی بھی برباد کر ڈالی۔

رفتہ رفتہ وہ یہاں گھل مل گئی۔ ان کی چھٹیاں بھی ختم ہو جانے کو تھیں، جس کے بعد دونوں نے اپنی پی ایچ ڈی مکمل کرنا تھا۔

☆☆☆

وہ دادی کے کسی رشتے دار کے ہاں دعوت پر جا رہی تھی۔ مجتبیٰ کا خاندان ان کے مقابلے میں کافی بڑا تھا۔ شادی کے دو ہفتوں تک مسلسل کسی نہ کسی کی ہاں دعوت ہوتی۔

مجتبیٰ اپنے کپڑے نکال رہا تھا۔ شلوار دیکھی تو ازار بند نہیں تھا۔

"لائیں، میں ڈالتی ہوں۔" اس نے اپنا میک اپ چھوڑا اور اس سے کپڑے لینے لگی۔

"نہیں...... تم اپنا میک......"

پلوشہ نے بنا کچھ کہے، اس سے شلوار لے لی۔ وہ شاور لینے اندر چلا گیا۔ ان کے درمیان ابھی تک روایتی میاں بیوی کے تعلقات نہیں تھے۔

وہ اس خوف سے کسی صورت چھٹکارا نہیں پا رہی تھی۔

اس کا دل چاہا، وہ مینو سے اپنی کشمکش کا اظہار کر دے، لیکن مینو نے فوراً ہی امی کو بتا دینا تھا...... لاکھ منع کرنے کے باوجود بھی......

جب وہ دعوت سے لوٹے، تو مجتبیٰ بھی عین اسی وقت آیا۔

ارسلان بھائی کی گہری عقاب جیسی نظروں نے تیزی سے اپنے کمرے جاتے مجتبیٰ کی طرف دیکھ لیا۔

"میاں! قمیص الگ...... شلوار الگ......" ارسلان بھائی کا قہقہہ بڑا جاندار تھا۔

سب کی نظریں مجتبیٰ کی شلوار پر جا پڑیں اور مجتبیٰ کے قدم رکے، اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ سب ہنس رہے تھے۔ اس نے سامنے دیکھا، جہاں پلوشہ کا چہرہ ایک دم فق ہو چکا تھا۔ اس سے پہلے کہ پلوشہ کے چہرے پر سب کی نظر پڑتی۔ اس نے فوراً کہا۔

"میں نے پلوشہ کو دو سوٹ نکالنے کا کہا تھا۔ میں نے بے دھیانی میں ایک کا شلوار پہنا اور ایک کی قمیص۔ جب نوشہرہ پہنچا تبھی کسی نے یوں مذاق اڑایا

تو دھیان گیا...... ویسے اتنا کوئی بڑا ایشو تھوڑی ہے' انسان ہے بھول چوک ہو ہی جاتی ہے۔''

''ہاں میاں' الٹی شلوار پہننے سے تو بہتر ہے پہن لی دوسری شلوار پہننا۔'' دادی نے ارسلان بھائی کی ٹانگ کھینچی۔

''آپ کو ضرور مجتبیٰ کی وکالت کرنی ہوتی ہے' دادی!'' ارسلان بھائی مصنوعی خفگی سے بولے۔''وہ تو شائستہ......''

دادی نے فوراً اس کی بات کاٹی۔''ہاں بھئی! اب سارا نزلہ بیگم پر اتار دو۔ خود آنکھوں کے بجائے بٹن لگے تھے۔''

''بس حادثہ تھا وہ ایک۔'' ارسلان بھائی نے ہار مان لی۔

وہ سب ایک دوسرے کے ساتھ ہنسی مذاق کر رہے تھے اور پلوشہ یک ٹک مجتبیٰ کو دیکھے جارہی تھی اس کا دل عجیب لے پر دھڑکتا جارہا تھا۔ دل' جو کچھ دیر پہلے خوف سے لرز اٹھا۔ اس شخص کے لیے دھڑک رہا تھا' جس نے سب کے سامنے اس کی غلطی کی پردہ پوشی کی تھی......

مجتبیٰ نے اس کو دیکھا اور اس نے مجتبیٰ کو۔ مجتبیٰ اپنے کمرے کی اور بڑھ گیا۔ پلوشہ بھی اس کے پیچھے ہولی۔

''آئی ایم سوری!'' وہ سر جھکائے کہہ رہی تھی۔ اس کی وجہ سے مجتبیٰ نے کتنی شرمندگی جھیلی تھی۔ اس کا دل پگھل کر' آنکھوں کے رستے آنسو بہانے لگا۔ مجتبیٰ نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور فوراً اس کی اور بڑھا۔

''تم رو کیوں رہی ہو۔ اتنی بڑی بات تھوڑی تھی کہ میں غصہ کرتا۔ غلطی تو میری بھی تھی۔ میں نے بھی بنا دیکھے پہن لی تھی۔'' وہ اس کا ہاتھ پکڑے کہہ رہا تھا۔ ایسے میں پلوشہ نے نظریں اٹھائیں' اور مجتبیٰ نے فوراً اس کے ہاتھ چھوڑے تھے۔ وہ شرمندہ ہو گیا تھا۔

پلوشہ کو اس کے ہاتھ چھوٹنے کا درد لمحے کے ہزارویں حصے میں اُہوا اور اس نے آگے بڑھ کر مجتبیٰ کا ہاتھ تھاما۔ خوف کی دیوار چھناکے سے ٹوٹی۔ مجتبیٰ نے آگے بڑھ کر' اس کے گالوں پر بہتے آنسو صاف کیے۔

پلوشہ کا دل اس کے لمس سے پگھلنے لگا تھا۔

☆☆☆

''میاں بیوی کا رشتہ اتنا مضبوط ہونا چاہیے کہ ان کے درمیان بے رخی کی' غلط فہمی کی دیوار حائل ہونا جائے ......وہ خود ہی زمین بوس ہو ...... کسی بھی تیسرے کی مدد یا مداخلت کے بغیر ......'' دادی کی آواز میں ماضی کے پرانے جھرنوں کی جھنکار سی تھی۔

حیدر کو ناشتہ کروا کر' وہ ابھی دادی کے ساتھ تخت پر بیٹھی چائے پی رہی تھی۔ حیدر اور مجتبیٰ قریبی مال گئے تھے۔

ان کی بات پر وہ ہلکا سا مسکرائی۔ دادی ٹھیک ہی کہہ رہی تھیں۔ وہ جو خود مجتبیٰ کی قربت سے خوف زدہ تھی۔ اس کے چھوتے ہی ماضی کا اژدھا اس کے اعصاب پر سوار ہو جایا کرتا تھا۔ وہ دیوار خدا نے خود ہی دھڑام سے زمین بوس کر دی تھی۔

''تم مجھے اس لیے نہیں پیاری ہو پلوشہ' کہ تم مجتبیٰ کی بیوی ہو اور اس شادی کے لیے ہم نے بہت سی کوششیں کیں بلکہ اس لیے...... کہ تم میرا ماضی ہو...... میرا آئینہ ہو تم۔ میرا پہلا شوہر......'' دادی کی نظریں چھت پر ٹکی تھیں۔ ان کی بات پر پلوشہ نے فوراً سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔'' انتہائی شدت پسند پختون تھا۔ بات بات پر غصہ ہوتا تھا۔ نمک نہ ہونے پر مارتا تھا اور زیادہ ہونے پر بھی۔ میں سہہ لیا کرتی تھیں کیونکہ مجھے ڈر تھا کہ اگر میں کچھ کہہ دوں تو مجھے طلاق دے دے گا اور میرا باپ شرم کے مارے کہاں کہاں منہ چھپاتا پھرے گا۔ پھر دنیا ایک دم سے بدل گئی' جب میں پیٹ سے ہو گئی۔ ایک دم سے الگ ......

میرے سوچنے کا نظریہ بدل گیا تھا۔ اندر بنتے وجود کی سوچیں ہمہ وقت ذہن میں چلتی تھیں۔ اور

تب میں نے خود کو مضبوط پایا کہ میرا بچہ ایک ایسے گھر میں نہیں پلے گا جہاں گالی دی جاتی ہو جہاں مار پیٹ کی جاتی ہو...... ایک ماں کیسے سہہ لے کہ اس کی اولاد کو اس کے سامنے پیٹا جائے؟ ...... پہلی بار میں نے اس کا ہاتھ روکا تھا۔ پورے خاندان میں میری ساس نے مجھے نافرمان اور بدکردار مشہور کر دیا۔ باپ نے بھی منہ موڑ لیا۔ مور جان نے خوب ہمت بندھائی۔

جس بچے کے لیے اتنا بڑا قدم اٹھایا وہ جنم لیتے ہی مر گیا۔ پھر میری دوسری شادی کروا دی گئی۔ اور تب سے میں نے یہ ٹھان لی تھی کہ میرے گھر میں کوئی بلاوجہ عورت پر ہاتھ نہیں اٹھائے گا گالی نہیں دے گا۔ ایک دن مجتبیٰ کے باپ نے اس کی ماں کو غصے میں کچھ کہا۔ اگرچہ غلطی اس کی تھی لیکن پھر بھی میں نے اس کو معافی مانگنے پر مجبور کر دیا۔ غلطی اس کی تھی یا نہیں مرد کو اپنے دل میں معاف کر دینے کی وسعت رکھنی چاہیے۔"

پلوشہ کے دل میں ان کی عظمت مزید بڑھ گئی۔ سر جھکا کر اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"میں آپ کی طرح بہادر نہ تھی۔ میں چپ چاپ ظلم سہتی رہی۔ اور سب سے بڑا ظلم یہی ہے۔"

"جو ہوا وہ ماضی ہے۔ ماضی کو سبق کے لیے یاد رکھنا چاہیے اس پر آنسو بہانے کے لیے نہیں۔ تم اپنی اس غلطی کو اپنی اولاد کی تربیت میں برابر کر دو۔ ایک ماں ہی اپنی اولاد کی فطرت بناتی ہے۔ اب دیکھو پورے خاندان میں میری اور میرے گھر کی مثالیں دی جاتی ہیں۔ اگر وہ عورت کے حقوق کے بارے میں ہو یا خود آپس میں بھائی چارے کی...... الحمدللہ میرے گھر کی کوئی مثال نہیں۔"

اس نے پہلی بار سر اٹھا کر فخر سے انہیں دیکھا۔ وہ اس گھر میں ان کی تربیت میں پلنے والے انسان سے خوف کیسے کھا سکتی ہے۔

اسی وقت مجتبیٰ اور حیدر داخل ہوئے۔ ان کو دیکھتے ہی اس کے چہرے پر ایک بھرپور مسکراہٹ سج گئی۔

☆☆☆

"آپ لوگوں نے دعوت کو پینڈنگ میں ڈالا ہوا تھا کب سے......" مینو اس سے فون پر گلہ کر رہی تھی۔ "شکر ہے تمہاری دادی نے اب آنے کی نوید سنا دی ہے۔ اچھا امی کہہ رہی ہیں کہ دادی سے کہیے گا اس بار ہوٹل میں مت ٹھہریے گا۔ یہاں انتظام کیا ہوا ہے۔"

"او کے...... مینو۔" وہ مسکرا کر بولی۔ "اچھا مجھے پیکنگ کرنی ہے۔ بعد میں فون کرتی ہوں۔"

اس نے یہ کہہ کر موبائل بند کیا اور پیکنگ کرنی لگی۔ ایسے میں پیچھے سے ایک مردانہ ہاتھ نے اس کی کلائی پکڑی اور اس کو اپنی اور کھینچا۔

اس کا چہرہ یک دم سرخ گلال ہو گیا۔

"اتنی پھیکی کلائیاں......؟" وہ خفگی سے بولا۔

"کلائیاں تو آپ کی بھی پھیکی ہیں۔" اس نے حساب برابر کرنے کے انداز میں ہنس کر کہا۔

"اب میں ان ہاتھوں پر مہندی لگاتے اچھا لگوں گا؟"

پلوشہ نے فوراً اپنے ہاتھ آگے کیے۔ "ان ہاتھوں پر تو لگاتے برے نہیں لگیں گے ناں......"

مجتبیٰ نے پھر سے اس کے ہاتھ پکڑے اور اپنی اور کھینچا۔ وہ شرارت سے کچھ کہنے والا تھا کہ وہ جلدی سے بولی۔ "حیدر!"

مجتبیٰ نے فوراً اس کا ہاتھ چھوڑا اور پیچھے مڑ کر دیکھا۔ وہ منہ پہ ہاتھ رکھے ہنس رہی تھی۔ مجتبیٰ نے مصنوعی خفگی سے منہ بسورا۔

"سارے رومانس کا بیڑہ غرق کر دیا۔"

"اور آپ جو میرا وقت برباد کر رہے ہیں اس کا کیا؟" وہ واپس پیکنگ کرنے لگی۔ "اتنا نہ ہوا کہ ایک کپ چائے بنا کر لے آئیں، بیگم صبح سے لگی کام کر رہی ہے۔"

مجتبیٰ نے اٹھ کر سیلوٹ کیا۔ "جو حکم، بیگم!"

وہ اس کی فرماں برداری پر مسکرادی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ چائے کے دو کپ لیے حاضر تھا۔ لیکن تب حیدر آچکا تھا اور اب پلوشہ کے ساتھ بیٹھا ہنسی مذاق کر رہا تھا۔

ایک گھنٹے بعد وہ سب اپنی اپنی گاڑیوں میں سوار، سوات جانے کے لیے تیار تھے۔

☆☆☆

"کبیر نے دو شادیاں کیں۔ پہلے اپنی کسی کولیگ سے۔ اس نے دوسرے مہینے ہی طلاق لے لی تھی اور پھر تائی کی دور کی کسی بھانجی سے...... وہ شادی تین ماہ چلی۔ اس نے کبیر کو ٹیسٹس کروانے پر راضی کیا اور ساری کمی کبیر کی ہی تھی، وہ ہی ان فرٹائل تھا۔" مینو کے لہجے میں ہلکا سا طنز تھا۔

"تین ناکام شادیوں کے بعد اب کوئی راہ چلتا فقیر بھی اس کو اپنی بیٹی نہ دے۔" مینو برتن دھوتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ وہ جو برتن کو دیکھتی' ماضی میں کھوئی ہوئی تھی۔ ایک دم اس نے منہ پر ہاتھ رکھا اور بیسن کی اور جھکی...... اندر آئی امی کا چہرہ خوشی سے لبریز ہو گیا۔

مینو اس کو جوس پیش کر رہی تھی اور اس کی ساس کو خبر کر کے مجتبیٰ کو بلا چکی تھی۔ جب وہ نکلی تو سب صحن میں کھڑے تھے۔

"چلیں؟" مجتبیٰ امی سے پوچھ رہا تھا اور وہ حیرت سے دیکھ رہی تھی۔

مینو نے ٹہوکا بھرا۔ ڈاکٹر کے پاس اور کہاں

مینو کی سرگوشی پر اس کا چہرہ ایک دم سرخ ہو گیا۔ مجتبیٰ کی مسکراتی آنکھوں سے نظریں چرا رہی تھی۔ جب وہ لیڈی ڈاکٹر کے ہاں لوٹ کر آئے تو دادی اس کی ماں کے گلے لگ رہی تھیں۔

"زیتون بیٹی! تم نانی اور میں پردادی بننے والی ہوں۔ الحمدللہ!"

زیتون بی بی اسی وقت اللہ کے سامنے سربسجود ہو گئی تھیں۔ ایک یہی خوف تھا جو ان کو پلوشہ کی دوسری شادی کے بعد ستائے جا رہا تھا۔

☆☆☆

اس نے ہلکے گلابی رنگ کے کپڑے پہن رکھے تھے۔ آج سیما باجی آئی تھیں اور حسب معمول حفیظ لالہ کے پورشن میں باربی کیو کا پروگرام تھا' جس کی ذمہ داری ساری مردوں کے سر تھی۔

"شکر ہے' اتنے عرصے بعد مجتبیٰ کا مسکراتا چہرہ دیکھ رہی ہوں۔" سیما باجی' مجتبیٰ کو خوشی سے دیکھتے ہوئے رہی تھیں۔ جو مرتضیٰ بھائی کے ساتھ گوشت کو مسالا لگا رہا تھا۔

وہ حیدر کو سوئٹر پہنا کر اپنے ساتھ لے آئی۔ وہاں ہلکی پھلکی باتیں چل رہی تھیں۔ کچھ دیر بعد جب وہ سب کھانا کھا چکے تو الاؤ کے گرد بیٹھ گئے۔

"مجتبیٰ! بہت عرصہ ہو گیا تم نے ہمیں کوئی گانا نہیں سنایا۔" صدف بھابھی نے فرمائش کی۔

"ہاں نا...... تمہارا گٹار بھی بے چارا تم سے ناراض ہو چکا ہو گا۔" سیما باجی بولیں۔

"نہیں۔ رہنے دیں۔" وہ ہنس کر سر نفی میں ہلا رہا تھا۔ سب شروع ہو گئے۔ "او کے فائن۔ بس ایک گانا۔"

سیما باجی کی بڑی بیٹی فوراً بھاگی اور اس کا گٹار اٹھا لائی۔ سب خاموشی سے اس کو سننے لگے۔ اس نے پلوشہ کو دیکھا۔

"یہ گانا میری پیاری بیوی کے لیے۔" اس نے محبت سے دیکھتے ہوئے کہا۔ سب کی شرارتی آوازوں پر پلوشہ کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

اس نے گانا شروع کیا۔

گل دی پہ زلفوں باندی قطار دی
(پھول تمہارے بالوں میں سجے ہیں)
دوانڑہ چشمان دی' گل وہ انار دی......
(دونوں آنکھیں کھلتی ہوئی پھول جیسی ہیں)
توبہ...... توبہ
گل دی پہ زلفوں......

وہ محبت سے اس کو دیکھتا گا رہا تھا۔ اور پلوشہ اس کی محبت میں پور پور ڈوب چکی تھی۔

☆☆